وطن میں اجنبی

جگن ناتھ آزاد

نوائے وقت (لاہور)

۱۷۔ستمبر ۱۹۵۲ء

آپ کی نظم "وطن میں اجنبی" کا ایک حصہ کراچی کے رسالہ "ادب" میں نظر سے گزرا۔ میں قطعاً جذباتی آدمی نہیں ہوں، مگر بعض حصے ایسے تھے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

حمید نظامی

(ایک خط کا اقتباس)

دانش گاہِ پنجاب (لاہور)

۱۶۔مئی ۱۹۵۲ء

مجھے آپ کی طویل نظم "وطن میں اجنبی" کے حصے بہت پسند آئے۔ آپ نے ایک جذب کے عالم میں یہ نظم کہی ہے۔ یہ نظم اَن گنت لوگوں کے جذبات کی آئینہ دار ہے۔

عبادت بریلوی

(ایک خط کا اقتباس)

ڈان (کراچی)

جگن ناتھ آزاد کی نظم "وطن میں اجنبی" اور دوسری غزلوں نے داد و تحسین حاصل کی آزاد نے اپنے اشعار میں پنجاب کی عظمت کی تصویر کھینچ دی اور اُسے ایک ایسی مقدس سرزمین کے الفاظ سے یاد کیا جس کی ہواؤں میں اقبال اور دوسرے طالبانِ حق کی نشو و نما ہوئی اور اُن نسلوں نے پرورش پائی جنھوں نے اس حق و صداقت کے پیغام کو دور دور تک پہنچایا۔ آزاد کے الفاظ میں پنجاب دلکش نغموں اور روحانی شاعری کی سرزمین ہے۔ ہیر و رانجھا اور سوہنی مہینوال کا ذکر آزاد نے بڑے اچھے انداز سے کیا ——

جگن ناتھ آزاد کو ہماری بہترین ادبی روایات نے جنم دیا ہے۔

۶۔مئی ۱۹۵۱ء کے بین الملکتی مشاعرہ (کراچی) کے تبصرے کا اقتباس

وطن میں اجنبی

مصنّف کی دوسری تصانیف

شعر

بیکراں — پہلا مجموعۂ کلام

ستاروں سے ذرّوں تک — دوسرا مجموعۂ کلام

نوائے پریشاں — چوتھا مجموعۂ کلام

اُردو — ایک طویل نظم

انتخابِ کلام — (انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ)

کہکشاں — (انتخاب کلام۔ پاکٹ بک سیریز)

نوحۂ ابوالکلام آزاد

نثر

اقبال اور اُس کا عہد

جنوبی ہند میں دو ہفتے

تلوک چند محروم (تالیف)

زیرِ طبع

نشانِ منزل (مجموعہ مقالات)

وطن میں اجنبی

جگن ناتھ آزاد

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

ملنے کے پتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

شاخ دہلی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار
دہلی ۶

شاخ بمبئی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسیس بلڈنگ جے جے ہسپتال
بمبئی ۳

پہلی بار (گجراتی رسم الخط میں) ۱۹۵۴ء
دوسری بار ۱۹۵۸ء

قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے

محبوب المطابع برقی پریس، اردو بازار دہلی

ترتیب

تعارف

طبع اوّل

ہندوستان کی تقسیم جن حالات میں ہوئی اُن کی دردناکی کا تذکرہ اب بیکار ہے، کیونکہ ان کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جس پر اہلِ درد اور درد رسیدہ لوگ جی بھر کے آہ و فغاں نہیں کر چکے۔

بلاشبہ دونوں طرف کے باشندوں نے سیاسی احساسات کے زیرِ اثر ایک دوسرے کے گلے کاٹے، ایک دوسرے کی آبرو ریزی کی۔ ایک دوسرے کا مال لوٹا، اور ایسی ناقابلِ تصور حرکات کا ارتکاب کیا جس پر انسانیت ہمیشہ خون کے آنسو روتی رہے گی لیکن ان

حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، کہ سارے ہندو، سارے مسلمان اور سارے سکھ درندے نہیں تھے۔ ان قوموں میں ایسے افراد بھی تھے جن کے قلوب محبت و درد مندی سے لبریز تھے۔ وہ اختلاف مذاہب کے باوجود اپنے باپ دادا کے وطن سے پیار کرتے تھے۔ اپنے ہمسایوں پر بھائیوں کی طرح نثار ہوتے تھے، اور ایک دوسرے کی تہذیب و ثقافت سے اچھی باتیں اخذ کرنے میں وسیع المشربی اور فراخ دلی کا ثبوت دیتے تھے۔ وہ ہرگز اپنے آبائی وطنوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کو صرف حالات نے نقل مکانی پر مجبور کردیا تھا۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ وہ مہاجر اور شرنارتھی ہونے کی حالت میں بھی اپنے دلوں کو اپنے قدیم وطنوں کی یاد سے لبریز پاتے ہیں، اور جب کبھی ان کو وہ پرانے تعلقات و روابط یاد آتے ہیں، جن کے سائے میں انھوں نے جنم لیا تھا، اور پروان چڑھے تھے تو ان کے دلوں پر چوٹ لگتی ہے، اور وہ بے اختیار اشکبار ہو جاتے ہیں۔ بے شک سیاسی و عقلی اعتبار سے انھیں اب سینے پر صبر کی سِل رکھ کر ماضی کو فراموش کردینا اور اپنے نئے وطن سے وابستہ ہو جانا چاہیئے۔ کیوں کہ گزرا ہوا زمانہ اب واپس نہیں آئے گا۔ لیکن جذبات پر عقل و خرد کی حکمرانی کب ہوئی ہے۔ کم از کم موجودہ نسل تو غم مافات کی آہوں اور یادِ ماضی کے آنسوؤں سے چھٹکارا نہیں پاسکتی۔ البتہ نئے ماحول میں پرورش پانے والی آئندہ

نسلیں اس دردناک تاریخ سے بے پروا ہو جائیں تو ہو جائیں۔

جگن ناتھ آزاد اسی قبیل کے شریف، وسیع المشرب اور درد مند انسانوں میں سے ہیں۔ تقسیم کے بعد سے ان کی شاعری اسی جذبۂ فراقِ وطن کی آہوں اور سسکیوں کی سرمایہ دار بن کر رہ گئی ہے۔ وہ آج کل کی زبان میں مسلم ادب اور مسلم کلچر کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔ حالانکہ صدہا سال سے یہی ادبی کلچر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ رہا ہے۔ بہر حال آزاد کا یہ اندازِ فکر ایک تو اُن کی فطری سعادت کا نتیجہ ہے، اور پھر ان کی ولادت و تربیت ضلع میانوالی میں ہوئی ہے جس میں مسلمانوں کی آبادی نوّے فی صدی سے بھی زیادہ تھی۔ انھوں نے ہوش کی آنکھ کھولی تو اپنے ارد گرد مسلمانوں ہی کو پایا۔ ان کے بچپن کے ہمجولی، ان کے لڑکپن کے دوست اور اُن کی جوانی کے احباب زیادہ تر مسلمان تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ایسے پاک نفس اور خوش ذوق باپ کے فرزند تھے، جنھوں نے آغاز ہی میں مسلمان قوم اور اردو شاعری سے اپنا رشتۂ مودت استوار کر لیا تھا، اور جو معلم ہونے کی وجہ سے ہزاروں مسلمان بچوں کے حسنِ تربیت کے ذمہ دار تھے۔ پھر آزاد نے اعلیٰ تعلیم راولپنڈی اور لاہور میں پائی، اور یہاں بھی اُن کے احباب کی اکثریت مسلمان تھی، اور ان میں جو ہندو تھے، وہ بھی اپنی افتادِ طبیعت اور اپنے ذوقِ سلیم کی وجہ سے آزاد کی بنیادی ادبی و معاشری

تربیت کے معاون ہی رہے، لہٰذا آزاد پر اس تنفّر اور انقطاع کا سایہ بھی پڑنے نہ پایا، جس نے اکثر ہندوؤں کو مسلمانوں سے کشیدہ و کبیدہ کر دیا تھا۔

جگن ناتھ آزاد ایک ایسا نہال تھا جو میانوالی کے سنگلاخ اور پنجاب ہی کے میدانوں میں پوری نشو و نما پا سکتا تھا۔ لیکن حالات کے باغبان نے اُس کو یہاں سے اُکھاڑ کر دہلی میں لگا دیا۔ بعض پودے ناموافق آب و ہوا میں پروان تو چڑھ جاتے ہیں لیکن دورانِ نشو و نما میں کبھی مرجھا جاتے ہیں۔ کبھی کُملائے ہوئے نظر آتے ہیں، اور مالی کو ہر وقت ان کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔

اس کتاب میں بظاہر آزاد کی متعدد نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ لیکن جو رُوح مسلسل ان میں جاری و ساری ہے، اس کے اعتبار سے یہ متعدد نظمیں نہیں ہیں، بلکہ ایک طویل نظم ہے، جس کے مختلف حصّے مختلف بحروں اور مختلف زمینوں میں موزوں ہو گئے ہیں۔ ہر بحر اور ہر زمین شاعر کے ہنگامی جذبہ و احساس کا پتہ دیتی ہے۔

پہلی مسدّس تو پنجاب کا ایک دردناک مرثیہ ہے، اور اس موضوع پر اب تک جو بے شمار نظمیں کہی گئی ہیں اُن میں اپنے درد و اثر کی وجہ سے بہت ممتاز ہے۔

اس کے بعد ترکِ وطن کی مجبوری کا ماتم ہے۔ پھر پاکستان آنے پر اپنے وطن پنجاب سے والہانہ فریفتگی کا اظہار ہے۔ واگہ کی سرحد پر شاعر کے دل پر کیا عالم گزرا ہے

جہانِ شوق کا ہر ذرہ پیچ و تاب میں ہے — یہ کس نے روح کو آواز دی خدا جانے
سُنا گئے مری پلکوں پہ آ کے اشکِ رواں — ہزار تلخ حقائق ہزار افسانے
وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے — خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے
دیارِ غیر میں اپنوں کی جستجو کیسی! — عزیز و خویش و اقارب تمام بیگانے

پھر شاعر روحِ پاکستان سے ہم کلام ہوتا ہے، اور پاکستان اس کو دعوت دیتا ہے کہ "پھر اپنی اُجڑی ہوئی انجمن کو واپس آ" لاہور کو جو شاعر کے نزدیک کعبۂ علم و فن ہے، مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں — چمن میں یادِ ایامِ بہاراں لے کے آیا ہوں
میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو — کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں
تمہارے واسطے اے دوستو! میں اور کیا لاتا — وطن کی صبح تک شامِ غریباں لے کے آیا ہوں

کس قدر سادہ، کس قدر سلیس اور سہل ممتنع غزل ہے جس کو پاکستانیوں نے جتنی دفعہ بھی آزاد کے پردرد لہجے میں سنا ہے، اُن کے دلوں سے ہُوکیں اُٹھی ہیں۔

اس کے بعد اقبال کے مزار پر رُوحِ اقبال سے باتیں ہوتی ہیں۔ راولپنڈی اور مری سے دعوتیں آتی ہیں، لیکن سیاست پا بہ زنجیر ہو جاتی ہے، اور شاعر تڑپ تڑپ کر اپنے دوستوں سے اپنی مجبوری کا ماجرا کہتا ہے۔ آزاد کو مشرقی پاکستان

نے بھی مشاعروں پر دعوت دی - چنانچہ ڈھاکہ اور چاٹگام جاتے ہوئے بھی بعض اس نے بعض دلاویز نظمیں لکھی ہیں - وہاں حفیظ سے ملاقات ہوئی - یہاں حفیظ کی ایک دلآویز غزل اور اس پر حضرت محروم کی ایک چیست اور استادانہ تضمین بھی شاملِ کتاب کردی گئی ہے۔

لاہور واپس آکر "پیرِ رومی اور مریدِ ہندی" کے انداز پر "اقبال و آزاد" کا ایک مکالمہ مرتب کیا گیا ہے جس میں آزاد کی طرف سے سوالات کی ترتیب اور اقبال کے کلام سے جوابات کا انتخاب قابلِ داد ہے - مولانا تاجور مرحوم کی روح اپنے عزیز شاگرد کو معنی خیز نصیحتیں کرتی ہے، اور آزاد اس کو اپنا کلام سناتے ہیں۔

عالمِ خیال میں سجّاد ظہیر، فیض، احمد ندیم، ممتاز حسین اور ظہیر کاشمیری سے ملاقاتیں ہوتی ہیں، اور آخر میں کراچی کا سفر پیش آتا ہے - یہاں وہ غزلیں درج کی گئی ہیں جنھوں نے کراچی کے ہر حلقے سے خراجِ اشک و آہ وصول کیا تھا ۔

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو - یہ کیا تم نے فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر ان شبستانوں پہ کیا گزری

وہ رنگ و نور سے بھرپور پرستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گزری

جگن ناتھ آزاد کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت درد و اثر ہے، جو خلوصِ احساس کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا، زبان کی گھلاوٹ، بیان کی سلاست اور حقیقت بینی نے اس کو برِ صغیر ہند و پاک کی صفِ اوّل میں جگہ دے دی ہے، اور وہ بلاشبہ اس مقام کا مستحق ہے۔

کراچی

۲۵۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء

عبدالمجید سالک

پیش لفظ

طبع دوم

آزاد کا اصرار میرے انکار پر غالب آیا، حالانکہ میں نے ان کو ہر طرح سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس دل نشین مجموعے پر پیش لفظ لکھنے کے لئے کسی زیادہ اہل شخص کو تلاش کریں۔ لیکن دوستی اور خوش فہمی کی آنکھ کمزوریاں دیکھنے میں ذرا کمزور رہوتی ہے۔ پیش لفظ لکھنے میں ایک اور دقت یہ ہے کہ اس کے پہلے اڈیشن پر پاکستان کے پختہ کار ادیب عبدالمجید سالک ایک نہایت اثر آفریں پیش لفظ لکھ چکے ہیں۔ اس کے بعد کوئی نئی بات کیا کہوں، اور کیوں کر کہوں، اور سالک صاحب کے

حسین انداز بیان کے مقابلے میں کس طرح کہوں ...... شاید زیادہ مضبوطی کے ساتھ انکار کرتا۔ لیکن جب ان نظموں کو پڑھا اور خلوص اور درد و محبت کے ان چھلکتے ہوئے پیمانوں سے کیف اٹھایا تو دل اتنا متاثر ہوا کہ انکار کرتے بن نہ پڑا۔ نفرت، تعصب اور بیگانگی کے اس ہنگامی دور میں محبت اور شرافت اور انسان دوستی کے اس پیغام کا سواگت نہ کرنا بھی جرم ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں رہنے والوں پر گذشتہ بیس سال میں جو گذری اُس کی وجہ سے بہت سے شریف اور دردمند دلوں میں اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ شاید انسانیت کی وہ قدریں، جو اس کا سب سے بیش بہا سرمایہ ہیں، اس طوفانِ بدتمیزی میں ہمیشہ کے لئے بہہ گئی ہیں، شاید اب انھیں من مندر کے سنگھاسن پر بٹھانا بہت مشکل ہو گا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس کے ایسے نیک بندے اب بھی موجود ہیں، دونوں ملکوں میں جنھوں نے اُن قدروں کا دامن نہیں چھوڑا، جو انسان کو عالمِ کائنات میں سربلند کرتی ہیں، جن کے قدم سچائی کے راستے سے نہیں ڈگمگائے، انھیں کا فیض ہے کہ نفرت کی آگ محبت کی بستی کو تہس نہس نہیں کر سکی۔ ان میں کچھ شاعر اور ادیب اور کلاکار ہیں، کچھ سیاست داں اور لیڈر ہیں (لیکن کسی قدر کم)، عام لوگ ہیں (لیکن ان کے خیالات اور جذبات کب اخباروں کی سرخیاں بنتے ہیں؟)

اور انھیں کے فانوس میں اُمید کی شمع روشن ہے اور آندھی کا مقابلہ کر رہی ہے۔ انھیں چند روشن ضمیروں میں جن کے دل میں گداز ہے اور آنکھوں میں انسانیت کے غم کے آنسو، جگن ناتھ آزاد بھی ہیں.......

اس مجموعے کی تمام نظموں میں ایک خاص کیفیت اور جذبہ جاری و ساری ہے، خواہ وہ سرزمین پنجاب کو الوداع ہو، یا پرانے دوستوں سے خطاب، یا اقبال کی بارگاہ میں نذرِ عقیدت یا پاکستان کو پیام۔ ایک حساس شاعر، جس کے قدم تقسیم ہند کے المیوں کے باوجود محبت اور شرافت کے راستے سے نہیں ڈگمگائے، کئی سال کے بعد اپنے قدیم وطن پاکستان میں ایک اجنبی کی حیثیت سے آتا ہے اور دل میں جذبات کا ایک طوفان لے کر آتا ہے جو اس کے شعروں میں خلوص اور محبت کے موتی بن کر چمکتے ہیں اور اس کی آنکھ میں آنسوؤں کی شبنم میں ڈھل جاتے ہیں، وہ اس کے دل میں بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کرتے ہیں، اور دوستی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر سے ایک شیرازۂ محبت میں سمیٹ لیتے ہیں۔ وہ پاکستانی دوستوں، ادیبوں اور شاعروں کی دعوت پر "مغربی پنجاب" آیا ہے، جس کو وہ اب بھی "وطن" کے پیارے لفظ سے خطاب کرتا ہے جس کی محبت کی چنگاری اب بھی اس کے دل میں روشن ہے، جس کے بارے میں وہ "مشرقی" اور "مغربی" کی تمیز نہیں کرتا جس کی

تہذیب اور روایات کے بنانے میں ہر مذہب اور ملّت کے معماروں نے اپنے دماغ کی روشنی اور دل کا خون صرف کیا ہے، وہ اس سرزمین کو بڑے جوش اور خلوص سے مخاطب کرتا ہے۔

اے وطن، اے فخرِ اقطاعِ جہاں | خاک تیری سجدہ گاہِ قدسیاں
حق پرستوں کے فقیروں کے وطن | دہر کے روشن ضمیروں کے وطن
نور کا جوہر ہے تیری خاک میں | عشق رقصاں ہے ترے ادراک میں
اے وطن، اے ہیر رانجھے کی زمیں | سوہنی و مہینوال کی بزم حسیں
اے محبت کے پرستاروں کے دیس | اے شجاعوں کے، جگرداروں کے دیس
فکرِ وارث شاہ کا مسکن ہے تو | قلبِ حق آگاہ کا مسکن ہے تو
تو ہے نانک کی نظر سے فیض یاب | قطبِ دوراں کے اثر سے فیض یاب

اور جب وہ اس محبوب سرزمین کو چھوڑنے پر مجبور رہوتا ہے تو اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

جس طرح چلے لعلِ یمن ملکِ یمن سے | یا جیسے چلے دُرِ عدن کانِ عدن سے
آہوئے ختن یا ہو رواں دشتِ ختن سے | آزاد ہم اس طرح چلے اپنے وطن سے

جس گھر کی فضاؤں میں جئے اور پلے ہم
اس گھر کو لگی آگ تو اس گھر سے چلے ہم

اور پھر واہگہ کی سرحد پر پہنچ کر جہاں سیاست نے وحدتِ شعور پر حد بندیاں قائم کر دی ہیں، جہاں اجنبیت کے بھیانک احساس سے دل کو ٹھیس لگتی ہے، یہ جذبات بے چین ہو کر ضبط سے رشتہ توڑ کر بہہ نکلتے ہیں۔

چھلک رہے ہیں نگاہوں سے دل کے پیمانے
ہیں آج رقص میں عہدِ طرب کے میخانے
یہ کس نے روح کو آواز دی خدا جانے
جہانِ شوق کا ہر ذرہ پیچ و تاب میں ہے
ہزار تلخ حقائق، ہزار افسانے
سنا گئے مری پلکوں پہ آ کے اشکِ رواں
خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے
وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے

کس قدر مختلف ہے یہ اندازِ فکر، یہ جذبہ ہند اور پاکستان کے ان یک چشم ادیبوں، شاعروں، اخبار نویسوں اور سیاست دانوں سے جو نہ تہذیب کی وحدت کے قائل ہیں، نہ انسانیت کے مشترک رشتوں کا پاس کرتے ہیں۔ جو سستی ہر دل عزیزی حاصل کرنے کے لیے یا ذاتی مفاد کی خاطر لوگوں میں تعصب کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ بعض دوسرے شاعروں اور ادیبوں نے بھی ان قدروں کا اعتراف کیا ہے۔ دشمنی اور مغائرت کے طوفان پر بند لگانے

کی کوشش کی ہے، لیکن ان میں سے اکثر نے مصلحت کے خیال سے ذرا دبی زبان اور محتاط قلم سے کام لیا ہے، شاید کسی نے بھی اس فرض کی علم برداری نہیں کی۔ اس صاف گوئی اور قوت کے ساتھ جو آزاد نے دکھائی ہے جی چاہتا ہے کہ پاکستان کا کوئی شاعر بھی اسی شان کے ساتھ محبت کی رسم و راہ کو، انسانیت کے ان مشترک رشتوں کو اُجاگر کرے، اور اس جذباتی خلیج کو پاٹنے میں قیادت کا فخر حاصل کرے جو دونوں ملکوں میں پیدا ہو گئی ہے۔

آزاد کے کلام پر اقبال کا بہت گہرا اثر ہے جس کا اُس نے ہر مقام پر بہت فخر کے ساتھ اعتراف کیا ہے۔ اس نے اقبال کے کلام سے اندازِ فکر اور اندازِ بیان لیا ہے، موضوع لئے ہیں۔ فکر کے سانچے اور زبان کی آب و تاب لی ہے، "مریدِ ہندی اور پیرِ رومی" کے انداز میں اقبال سے گفتگو کی ہے، اور اس کے مزار پر جا کر نہ صرف خراجِ عقیدت پیش کیا ہے بلکہ دل میں جو سوال کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے اُن کا جواب طلب کیا ہے۔ اقبال کے ایک شعر میں خفیف سا تصرف کر کے آزاد نے ان سے اپنا فکری رشتہ یوں بیان کیا ہے۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہوں میں
مرے لئے ہے ترا شعلۂ نوا قندیل!

ظاہر ہے کہ یہاں شاعر جس قافلے کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ ہندوستان یا پاکستان، ہندو یا مسلمان، مشرق یا مغرب کا قافلہ نہیں بلکہ ان شریف اور پاکباز اور فراخ دل انسانوں کا قافلہ ہے جن میں قدرِ مشترک محبت اور انسانیت ہے نہ کہ رنگ یا نسل یا قومیت یا مذہب۔ اس نے ان بنیادی قدروں کی علمبرداری کی ہے جو اقبال کے کلام اور فلسفہ کو عالمگیری بخشتی ہیں۔ استاد کی مخصوص سرزمین میں قدم رکھنا اور اس کے خاص میدان میں طبع آزمائی کرنا ایک جرأت طلب کام ہے "جس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں"۔ لیکن آزاد بڑی حد تک ان خطروں سے دامن بچا کر گذرا ہے۔

"روحِ تاجور کی آواز" کے عنوان سے شاعر نے خود کو خطاب کر کے ہندوستانیوں کو خاص طور پر دعوت دی ہے کہ وہ انسانیت کے جذبے کو پالیں اور ہر قسم کے بھید بھاؤ اور نارواداری اور تنگی سے اپنے دامنِ دل کو پاک رکھیں۔ اس نے جرأت کے ساتھ انھیں یہ پیغام سنایا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جو اقلیت میں ہیں، خاص طور پر دل نوازی کا سلوک کریں تاکہ وہ بھی شمعِ وطن پر پروانوں کی طرح نثار ہوں۔ اور یہ کون سا وطن ہے۔

یہ نئی دنیا تری، یہ خطۂ گنگ و جمن یہ دیارِ بدھ، یہ گاندھی کا، نہرو کا وطن

گلستانِ علم و حکمت کا مہکتا پھول ہے
بہرِ الفت کا، محبت کا، مہکتا پھول ہے

یہ نئی دنیا تری تہذیب کی ہے انجمن
دیکھ پاکیزہ رہے اس انجمن کا بانکپن

پستیِٔ افکار تیرے دل کے مسکن میں نہ ہو
ناروا داری کا کانٹا تیرے گلشن میں نہ ہو

ہند میں مُسلم کو بیگانہ کوئی کہنے نہ پائے
یہ غلط بنیاد افسانہ کوئی کہنے نہ پائے

اس طرح مُسلم رہے ہندوستاں کی گود میں
جس طرح رہتا ہے بچّہ اپنی ماں کی گود میں

یہ تحفّظ ہو تو پھر اس کی وفاداری کو دیکھ
دیکھ اپنے خون سے پھر اس کی گُلکاری کو دیکھ

جاں لُٹا دے گا یہ خود ہندوستاں کے واسطے
جس طرح مِٹتا ہے بلبل گلستاں کے واسطے

اس مجموعے کا وہ حصہ بھی قابلِ ذکر ہے جس کا عنوان ہے "عالمِ خیال کی چند ملاقاتیں" یہاں وہ سجّاد ظہیر، فیض، احمد ندیم، ممتاز حسین، اور ظہیر کاشمیری سے ملتا ہے، اور اپنی گرم جوشی، انسان دوستی، اخلاص اور محبت کا خزانہ ان کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ یہ نظمیں (جن کے ساتھ ساتھ اس نے ان شاعروں کے بھی چند نظمیں شامل کی ہیں) اس ہم آہنگی اور وحدتِ خیال کا پتہ دیتی ہیں، جو اب بھی ہند اور پاکستان کے بعض انسان دوست ادیبوں اور شاعروں میں پائی جاتی ہے، اور اس برِ صغیر کے مستقبل کے لیے ایک تابناک شگون ہے۔ ان کے کلام میں ایک صبحِ نو کے طلوع کی آرزو اس طرح جھانکتی ہے جس طرح صبح سویرے

برسات کے اندھیرے بادلوں میں سے کبھی کبھی سورج کی پہلی کرن پھوٹتی ہے۔ ہر وہ ادبی کاوش، جو اس محبت اور انسان دوستی کی تحریک کو آگے بڑھائے ہماری تائید اور اعتراف کی مستحق ہے۔

آزاد نے اس مجموعے کا نام "وطن میں اجنبی" رکھا ہے۔ مجھے اس نام کی موزونیت میں شبہ ہے۔ جو شخص "سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو" کا ایسا انمول خزانہ لے کر کسی دیس میں جائے، وہ اس میں اجنبی نہیں ہو سکتا، محبت کی شمع اس کو پردیس میں بھی راستہ دکھائے گی، اور شیریں کلامی اور خلوص قدم قدم پر اس کے لئے دوست پیدا کریں گے، اور پھر پنجاب میں آزاد کس طرح بیگانہ ہو سکتا ہے، جس کی محبت اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے، اور جس کی تہذیب کے نغمے اور یاد اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے من مانی اجنبیت کی زنجیروں کو توڑ کر "پاکستان کی آواز" ان لفظوں میں آزاد کا خیر مقدم کرتی ہے۔

وطن کو بھولنے والے وطن کو واپس آ
غزالِ دشتِ ختن پھر ختن کو واپس آ

اداس اداس ہیں پھولوں کے چہرہ ہائے جمیل
تو اے بہارِ چمن پھر چمن کو واپس آ

ترے فراق میں گریاں ہیں چشم راوی و سندھ
اسی فضا، اسی بزمِ کہن کو واپس آ

شملہ۔ ۱۷۔ جون ۱۹۵۷ء

خواجہ غلام السیدین

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے

جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے

انیس

پنجاب

فردوس کا عالم مرے پنجاب کی دنیا
تسکین کے آرام کے اسباب کی دنیا
سیلابِ محبت کے وہ گرداب کی دنیا
درد و تپش و سوز و تب و تاب کی دنیا

وہ ارضِ حسیں خطّۂ محبوبِ زمانہ
کرتا ہوں بیاں اُس کی تباہی کا فسانہ

جب رات گئی صبح کا پرتو نظر آیا
جب ملک غلامی کی حدوں سے گزر آیا
جب وقت نئے دور کی لے کر خبر آیا
سوکھی ہوئی جب شاخِ دعا میں ثمر آیا
اک موجِ خزاں صحنِ گلستاں میں در آئی
ہر سمت تباہی پہ تباہی نظر آئی

ہر پھول کے دامن میں شرارے نظر آئے
ہر شاخِ چمن زار میں کانٹے اُبھر آئے
خوشبو کے عوض موجِ صبا میں شرر آئے
بکھرے ہوئے انوارِ طلوعِ سحر آئے
پھولوں سے ہوئی دم میں فضا باغ کی خالی
خود باغ کے درپے جو ہوئے باغ کے مالی

خود باغ کے مالی جو ہوئے باغ کے دشمن
اس خاک کا ہر گوشہ ہوا شعلہ بدامن
اپنا ہی چمن زار تھا اپنا ہی نشیمن
شاداں ہوئے جلتا ہوا دیکھا جو یہ گلشن

اس باغ کا تھا دھرم بھی ایماں بھی محافظ
ہندو بھی محافظ تھا مسلماں بھی محافظ
ہندو نے لیا وید کی عظمت کا سہارا
قرآں کے تقدس کو مسلماں نے پکارا

سکھ دھرم سے ہو دور کہاں اس کو گوارا
یوں لے کے زمانے میں مذاہب کا اجارا
فردوس میں ان سب نے جہنم کو بسایا
پنجاب میں سامانِ قیامت نظر آیا

مٹی ہوئی تقسیم، محبت ہوئی رخصت
اخلاص گیا، مہر و مروّت ہوئی رخصت
چہروں سے ہنسی دل سے صداقت ہوئی رخصت
پنجاب کی دیرینہ شرافت ہوئی رخصت

قسمت سے جو دن بزمِ الم ناک کے بدلے
تقسیم کی حد دل پہ کھنچی خاک کے بدلے

اک حشر کا سامان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
اک آگ کا طوفان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
انسان پریشان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی
ہر روح میں پیکان اِدھر بھی تھا اُدھر بھی

پنجاب میں اک قہرِ الٰہی کا سماں تھا
دونوں طرف انساں کی تباہی کا سماں تھا

احباب کی آنکھوں سے برستے تھے شرارے
یوں جل کے ہوئے راکھ محبّت کے سہارے
ہر سمت جو رقصاں ہوں قیامت کے نظارے
مجبور کوئی ہو تو بھلا کس کو پکارے

ہر سمت سرِ ارض قضا ناچ رہی تھی
دریاؤں کی موجوں میں بلا ناچ رہی تھی
بوڑھے تھے کہ بچے تھے نہ تھا ان میں کوئی فرق
انسانیت اک خون کے سیلاب میں تھی غرق
تھا ایک جہنّم کا نمونہ چمنِ شرق
یوں برگ و گل و بار پہ تھی شعلہ فشاں برق
چاہوں بھی تو لفظوں میں بیاں کر نہ سکوں میں
تصویر میں یہ رنگ کبھی بھر نہ سکوں میں

اس طرح ہوا گرمِ عمل عالمِ پیکار
نسوانیتِ زن پہ اٹھی مرد کی تلوار
مُردے تھے پڑے سڑکوں پہ انبار در انبار
معصوموں کی لاشوں سے بھرے کوچہ و بازار
اے دیدۂ افلاک کبھی یوں بھی ہوا ہے
اے آدمِ بیباک! کبھی یوں بھی ہوا ہے

ریلیں ہیں کہیں سیلِ حوادث کا ٹھکانہ
بستے ہوئے ہنستے ہوئے گھر بم کا نشانہ
معلوم اگر ہو تو بتا دورِ زمانہ
اُجڑے ہوئے یہ لوگ ہیں کس سمت روانہ
اب کون سی دنیا میں کریں گے یہ بسیرا
راتوں کے مسافر ہیں یہ دیکھیں گے سویرا

معصوموں کے اجسام ہیں نیزوں کی انی پر
تلواروں پہ پیرانِ کہن سال کے ہیں سر
خنجر وہ گیا سینۂ عورت سے گذر کر
غش کھا کے گرے دیکھے جو شیطان یہ منظر

آزاد نئے دور کی تہذیب کا نقشہ
تعمیر کا عالم ہے کہ تخریب کا نقشہ

جنگل میں کیا قافلۂ غم نے بسیرا
دیکھو وہ اُسے گردشِ ایام نے گھیرا
وہ دست و گریباں ہے اُجالے سے اندھیرا
اک حشر ہے یاں کوئی نہ تیرا ہے نہ میرا

اک سیلِ قیامت سرِ انساں پہ رواں ہے
"انصاف کو آواز دو انصاف کہاں ہے"

جن ہاتھوں نے صد چاک کئے ماؤں کے سینے

سینے — ابدی مہر و محبت کے دفینے

لُوٹے ہیں جنھوں نے یہ وفاؤں کے خزینے

وہ ہاتھ ہیں کس درجہ شقی اور کمینے

اُن ہاتھوں کو ہو دامنِ مذہب کا سہارا

دیکھو تو ذرا اہلِ جہاں یہ بھی نظارا

ننگا کیا جس ہاتھ نے عورت کے بدن کو

برباد کیا جس نے تقدّس کے چمن کو

جس ہاتھ نے خوں رنگ کیا دشت و دمن کو

جس ہاتھ نے تاراج کیا اپنے وطن کو

اُس ہاتھ پہ اب دھرم کے دامن کا ہو سایا

یہ راز سمجھ میں کبھی آئے گا نہ آیا

دوشیزہ کی تقدیر کا ڈوبا وہ ستارا
دم اس پہ بھی ماں باپ کی دُرگت نے نہ مارا
ہمشیر کا یاں دامنِ عصمت ہے دو پارا
اور بھائی کھڑا دیکھ رہا ہے یہ نظارا

کس رو پہ ترا عالمِ ایجاد رواں ہے
اے داورِ محشر! تو اگر ہے تو کہاں ہے

اس درجہ بڑھی کشمکشِ دھرمی و دیندار
کوئی نہ رہا جنسِ شرافت کا خریدار
تھا دامنِ ہر صبحِ وطن خون سے گلنار
پیشانیٔ ہر شام پہ شب خوں کے تھے آثار
اک دم کا سکوں بھی نہ تھا انساں کو گوارا
کیا جانئے کس فطرتِ بد کا تھا اشارا

انسان سے انسان رہے لرزہ براندام
ہو فصل ہی افسانۂ ہر وصل کا انجام
صیّادیٔ افرنگ کے اے مرغِ تہِ دام
گیتا کے یہ اُپدیش ہیں یہ شرع کے احکام؟

اُترے نہ کبھی جہل کا چڑھتا ہوا پارا؟
انساں کو نہ ہو ہستیٔ انساں بھی گوارا؟

اے اپنے گلستاں کی تباہی کے طلبگار
اچھی ہے یہ تیری روشِ خدمتِ اغیار
چھوڑی نہ کبھی کشمکشِ سبحہ و زنّار
صد حیف ہے اے جنسِ غلامی کے خریدار

اغیار نے اک بار سبق جو بھی پڑھایا
افسوس کہ تو نے اُسے سینے سے لگایا

انسان کا دل اور ہو اتنا ستم ایجاد
انسان ہی مقتول ہو انسان ہی جلّاد
انسان ہی خود صید ہو انسان ہی صیّاد
فریاد ہے فریاد ہے فریاد ہے فریاد
انسان کی یہ وسعتِ دامانِ تمنّا!
ملعون ہے ملعون یہ پایانِ تمنّا!

آزاد! کہاں تک یہ الم ریز ترانہ
اپنا ہی چمن زار تھا، اپنا ہی نشانہ
روداد یہی کچھ ہے اب اے اہلِ زمانہ
پنجاب ہے اک دورِ گذشتہ کا فسانہ
اس خاک میں پہلی سی تب و تاب نہیں ہے
دوآب ہے، سہ آب ہے، پنجاب نہیں ہے

ظاہر میں ہیں فردوسِ نظر اب بھی نظارے
آباد ہیں دریاؤں کے شاداب کنارے
افلاک پہ رخشاں ہیں وہی چاند ستارے
ممکن ہے وہی اب بھی ہوں تاروں میں اشارے
دل کہتا ہے ماحول میں وہ بات نہیں ہے
گردوں کا ہے وہ رنگ نہ وہ رنگِ زمیں ہے
وہ باغ ہے پنجاب جو ہو پھول سے خالی
وہ مردِ تونگر ہے جواب خود ہو سوالی
یہ ہے وہ سمندر کہ ہو محرومِ لاآلی
تصویر ہے پنجاب مگر محض خیالی
اب روحِ وطن محفلِ پنجاب کہاں ہے
پیکر تو ہے لیکن دلِ پنجاب کہاں ہے

تا زیست ہمیں یاد رہیں گے ترے احسان

برہم ہوئی آنے سے ترے محفلِ یاراں
اے باغِ سیاست کی نسیمِ طرب افشاں
تا زیست وہ رکھیں گے ترے یاد یہ احساں
جن سے تری آمد نے چھڑایا چمنستاں

تقدیم و تاخیر

"وہ" کیا مطلب ہے

"دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے"

جس طرح چلے لعلِ یمن ملکِ یمن سے
یا جیسے چلے دُرِّ عدن کانِ عدن سے
آہوئے ختن یا ہو رواں دشتِ ختن سے
آزاد! ہم اس طرح چلے اپنے وطن سے

جب گھر کی فضاؤں میں جئے اور پلے ہم
اُس گھر کو لگی آگ تو اُس گھر سے چلے ہم

اتنا بھی نہ سوچا کہ چمن اپنا چمن ہے
گو شعلہ بداماں ہے مگر اپنا وطن ہے
پنہاں جو یہیں خاکِ گل و سرو سمن ہے
رُک جاؤں کہ مٹنے کو ہی یہ دورِ فتن ہے

اس غم میں مری روح پریشاں ہے ابھی تک
اک درد سا احساس میں غلطاں ہے ابھی تک

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

حفیظ جون پوری

افکارِ پریشاں

آغازِ بہاراں دیکھ لیا، انجامِ بہاراں روشن ہے
تدبیرِ گلستاں کے صدقے، تقدیرِ گلستاں روشن ہے

گو حال کی تند ہواؤں نے ہر سمت گھٹائیں پھیلا دیں
ماضی کے تصور سے پھر بھی یادوں کا شبستاں روشن ہے

کب فصلِ بہار آئی تھی یہاں، کب برق گری کچھ یاد نہیں
لیکن اب تک اُن شعلوں سے ماحولِ گلستاں روشن ہے

دیروز پہ جاں دینے والے! فردا سے کبھی مایوس نہ ہو
کچھ ماضیِ انساں سے بڑھ کر مستقبلِ انساں روشن ہے
اک شمع سی دل میں جلتی ہے اے اہلِ چمن اے اہلِ وطن
اس شمع سے زنداں کی دنیا مانندِ چراغاں روشن ہے
یہ ظلمتِ گلشن دیکھ کے کیوں آزاد ہوا مایوس اتنا؟
کل جس کو نگاہیں دیکھیں گی وہ صبحِ بہاراں روشن ہے

○

رشتہ بپا قفس میں ہے طائرِ نو شکستہ پر
ہائے یہ وسعتِ فضا ہائے یہ رفعتِ نظر
بچ نہ سکے نگاہ میں اور کہیں کے باغ و راغ
رُک نہ سکے کہیں قدم چھوڑ کے گھر کے بام و در

ہائے یہ عالمِ بہار ہمنفسو کہوں تو کیا
رُوح پہ کیا گذر گئی صحنِ چمن کو دیکھ کر
اپنی نظر کا کیا علاج اپنی نظر کو کیا کروں؟
اپنے چمن کو چھوڑ کر جم نہ سکی کہیں نظر

○

آرہے ہیں مجھے پیغام پہ پیغام ہنوز
پائے جاتا ہے دل انعام پہ انعام ہنوز
کون پوچھے ترے گلزار کا دستور ہے کیا
کوئی آزاد ہے کوئی ہے تہِ دام ہنوز
مرا آغاز معمّہ ہے ابھی تک مجھ پر
ہو سکا مجھ پہ نہ ظاہر مرا انجام ہنوز

بارہا جس کو ہوا سامنا نومیدی کا
مرے سینے میں وہی ہے ہوسِ خام ہنوز
عالمِ دل کے شب و روز ہیں ویراں لیکن
دیدۂ شوق میں پھرتے ہیں وہ ایّام ہنوز
ذکر رہتا ہے ابھی تک کسی محفل میں مرا
میں نہیں رونقِ محفل ہے مرا نام ہنوز

○

دے فریب اور نہ دورِ ستم ایجاد مجھے
کہ اک اُجڑی ہوئی محفل ہے ابھی یاد مجھے
جو سماں عمرِ رواں ساتھ لئے بیت گئی
وہ اب اے چشمِ تصوّر نہ دلا یاد مجھے

یہ الگ بات ہے میں نغمہ سرا ہو نہ سکوں
اب بھی کہتا ہے زمانہ تو چمن زاد مجھے

میں ہوں وہ پھول کہ اب جس کی تمنا یہ ہے
نو بہاروں کے زمانے نہ کریں یاد مجھے

میرے نغمے کا ہے مفہوم بہت اُن سے بلند
اور مشکل ہے کہ آتی نہیں فریاد مجھے

واپسی دورِ گزشتہ کی مرے بس میں نہیں
دوستو! اور زیادہ نہ کرو یاد مجھے

عیشِ زنداں سے تو انکار نہیں ہے لیکن
چین لینے جو نہ دے فطرتِ آزاد مجھے

○

کشادہ رو ہو کے رہ زمانے میں بے نیازِ غمِ زمانہ
کہ تو زمانے میں اک حقیقت ہے اور زمانہ ہے اک فسانہ

○

قطعہ

بند کلیاں ٹہنیوں سے خاک پر کٹ کر گریں
شاخِ گل پر نوشگفتہ غنچے کملانے لگے
انقلابِ روزگار ایسا کبھی دیکھا نہ تھا
فصلِ گل آئی چمن میں پھول مرجھانے لگے

○

قطعہ

عجب خموشی و تنہائی ہے جہاں میں ہوں
کہیں سے کان میں کوئی صدا نہیں آتی

بلا بلا کے رفیقوں کو تھک گیا ہوں مگر
کسی طرف سے بھی آوازِ پا نہیں آتی

○

مذاقِ مے کشی رندوں کا جب تک خام ہے ساقی
تعجب کیا جو تیرا میکدہ بدنام ہے ساقی
خدا جانے گریں گی کب من و تو کی یہ دیواریں
یہ اس کا جام ہے ساقی یہ اس کا جام ہے ساقی
نظامِ میکدہ اب تک ہے غیروں کے اشارے پر
نہ اپنی صبح ہے ساقی نہ اپنی شام ہے ساقی
مذاقِ تشنگی کی پختہ کاری بھی بڑی شے ہے
یہی شے ہے جو دورِ نو میں اکثر خام ہے ساقی

جو ممکن ہو تو کچھ انجامِ جسم سے آشنا کر دے
کہ میرا جامِ مے بیگانۂ انجام ہے ساقی
مذاقِ مے کشی کی شستگی نعمت سہی لیکن
مذاقِ تشنگی اس سے بڑا انعام ہے ساقی

○

رُباعی

مانا کہ سمندر میں وہ طوفاں نہ رہا
امواج میں وہ جنونِ رقصاں نہ رہا
پانی کا بہاؤ یہ بتاتا ہے مگر
اب تم سے ملاقات کا امکاں نہ رہا

خاک وطن از ملک سلیمان خوشتر است

خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر است

یوسف که به مصر پادشاهی می کرد

می گفت گدا بودن کنعان بودن

بازگشت

پاکستان کے قُرب وجوار میں پہنچ کر

اے مری ارضِ وطن ! اے ارضِ پاک

قلبِ عالم کی ضمیرِ تابناک

اے وطن ! اے خطّۂ اربابِ ذوق!
زندگی تیری سراپا جذب و شوق
اے وطن ! اے فخرِ اقطاعِ جہاں
خاک تیری سجدہ گاہِ قدسیاں
حق پرستوں کے فقیروں کے وطن
دہر کے روشن ضمیروں کے وطن
نور کا جوہر ہے تیری خاک میں
عشق رقصاں ہے تری ادراک میں
تیرا ہر ذرّہ ہے تاروں سے بلند
خاک تیری مثلِ اکسیر ارجمند
اے وطن ! اے ہیر رانجھے کی زمیں
سوہنی و مہینوال کی بزمِ حسیں

اے محبت کے پرستاروں کے دیس
اے شجاعوں کے جگرداروں کے دیس
دائمی ہے آج تیری آب وتاب
تجھ پہ چمکے ہیں ہزاروں آفتاب
فکرِ وارث شاہ کا مسکن ہے تو
قلبِ حق آگاہ کا مسکن ہے تو
تو ہے نانک کی نظر سے فیض یاب
قطبِ دوراں[1] کے اثر سے فیض یاب
رام تیرتھ تجھ پہ نور افشاں رہا
ابرِ مستی تھا سرور افشاں رہا

---

[1] اعلیٰ حضرت سید شیخ مخدوم علی ہجویری

اے وطن تو ہے وہ پاکیزہ جہاں
جس میں گونجا نعرۂ خوشحال خاں
اور وہ محراب گُل مردِ سلیم
جس کا دل تھا بے نیازِ یاس و بیم
شاعرِ رنگیں مزاج و پختہ کار
جاودانی زندگی کا راز دار
وہ بہادر وہ فقیرِ بے گلیم
تھا ترے ہی طورِ معنی کا کلیم
اے وطن! اے مہر و الفت کے چمن
میری دیرینہ محبت کے چمن
تو امانت دارِ ماضی ہے مرا
محرمِ اسرارِ ماضی ہے مرا

میں کہ تیرا ہی گُلِ صد پارہ ہوں
نکہتِ گُل کی طرح آوارہ ہوں
دشتِ غربت میں وطن سے دور ہوں
پھول ہوں اپنے چمن سے دور ہوں
اے وفا رسم و نشاط آئینِ چمن
اے مرے بچھڑے ہوئے رنگیں چمن
آج پھر تیری طرف ہوں تیز گام
دیکھ اک پابند کا ذوقِ خرام
دشتِ غربت چھوڑ کر آیا ہوں میں
صورتِ بادِ سحر آیا ہوں میں
تو مجھے میری امانت سونپ دے
پھر مجھے اپنی محبت سونپ دے

واہگہ کی سرحد پر

"عشقِ شور انگیز را ہر جادہ در کوئے تو بُرد
بر تلاشِ خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تو بُرد"

ہیں آج رقص میں عہدِ طرب کے میخانے
چھلک رہے ہیں نگاہوں سے دل کے پیمانے
جہانِ شوق کا ہر ذرّہ پیچ و تاب میں ہے
یہ کس نے روح کو آواز دی خدا جانے
سنا گئے مری پلکوں پہ آکے اشکِ رواں
ہزار تلخ حقائق ہزار افسانے
وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے
خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے

دیارِ غیر میں اپنوں کی جستجو کیسی؟

عزیز و خویش و اقارب تمام بیگانے

"غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

بیا و ریدہ گر ایں جا بُوَد زباں دانے"

غلط فہمی

میں سمجھتا تھا وطن ہے میرے غم سے بے خبر

ارضِ پاکستاں تڑپ اُٹھی مری فریاد پر

اک صدائے دردناک اُس خاک کے دل سے اُٹھی

موجِ طوفاں یا کوئی دامانِ ساحل سے اُٹھی

اک صدا — جس سے مری بزمِ تمنّا ہل گئی

اک فغاں — جس سے مرے جذبوں کی دُنیا ہل گئی

یہ صدا اُتری مرے سینے میں نشتر کی طرح
گلستانِ دل میں آئی موجِ صرصر کی طرح
یہ صدا کیا تھی وطن کی رُوح کا پیغام تھی
یا مری گم گشتگی کے دور کا انعام تھی

شکوۂ پاکستان

چمن کی شوخ اداؤں کو بھولنے والے
سرور پاش ہواؤں کو بھولنے والے
نظر نواز مناظر اُتر گئے دل سے
سیاہ پوش گھٹاؤں کو بھولنے والے
سکوں فروش فضاؤں سے دور جا پہنچا
سکوں فروش فضاؤں کو بھولنے والے

وطن کو بھولنے والے وطن کو واپس آ
غزالِ دشتِ ختن پھر ختن کو واپس آ
اُداس اُداس ہیں پھولوں کے چہرہ ہائے جمیل
تو اے بہارِ چمن! پھر چمن کو واپس آ
ترے فراق میں گریاں ہے چشمِ راوی و سندھ
اُسی فضا اسی بزمِ کُہن کو واپس آ
اُن اپنی انجمن آرائیوں کی تجھ کو قسم
پھر اپنی اُجڑی ہوئی انجمن کو واپس آ
کبھی بہ نطق و تکلّم کبھی خموشی سے
ہزار طرح بہاروں نے تجھ کو یاد کیا
سکوں بدوش ہواؤں نے آہِ سرد بھری
جنوں فروش نظاروں نے تجھ کو یاد کیا

مری زمیں پہ ترا جب کہیں نشاں نہ ملا
تڑپ تڑپ کے ستاروں نے تجھ کو یاد کیا

جوابِ آزاد

سرابِ دشت نے دھوکے دیئے ہیں بارہا پھر بھی
نظر میں ہے ابھی رنگِ طلسماتِ چمن اپنا
نہیں وحشی کہ آوارہ پھروں دشت و بیاباں میں
کسی گوشے میں رہنے دے اگر مجھ کو چمن اپنا
ذرا دیکھ اے وطن! آزادیٔ ذوقِ نظر میری
وہ طائر ہوں کہ زنداں کو سمجھتا ہوں چمن اپنا
ترے ماحول میں پھر ان دنوں رقصِ بہاراں ہے
یہی تیور تھے موسم کے جب اُجڑا تھا چمن اپنا

ندائے پاکستان

کبھی خزاں کے بگولے کبھی نسیمِ بہار
دل و نظر کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں

بہت نہیں فقط اہلِ جنوں کی ایک نظر
یہ بے ثبات زمانے بدلتے رہتے ہیں

اُسی بہارِ چمن کا پھر انتظار نہ کر
کہ بجلیوں کے نشانے بدلتے رہتے ہیں

فقط خزاں ہی بدلتی نہیں ترانۂ شوق
بہاریں بھی ترانے بدلتے رہتے ہیں

کبھی برنگِ تبسم کبھی بصورتِ اشک
یہ زندگی کے فسانے بدلتے رہتے ہیں

لاہور میں ورود

خطۂ لاہور منزل گاہِ تہذیب و ادب
علم کے انوار سے روشن ہیں جس کے روز و شب
سینۂ پنجاب کا دل، بلدۂ مینو سواد
خاک جس کی اہلِ دل کے واسطے انجم نژاد

جس کو بخشی ہے تمدّن نے نرالی زندگی

جس کے بام و در پہ ہے تہذیب کی تابندگی

سرزمینِ گنج بخش و خطّۂ عبدالمجید

ہند و پاکستان میں اک قفلِ معنی کی کلید

کشورِ محبوبِ طالب[1]، سرزمینِ برہمن[2]

جن کی موجِ نطق سے مہکا گلستانِ سخن

---

[1] طالب آملی جس نے لاہور کی مدح میں یہ اشعار کہے

گمانم نیست کاندر ہفت کشور — بُوَد شہرے بہ آب و تابِ لاہور

میاں بگشا و خوش میکش کہ در ہند — فراغت نیست جز در خوابِ لاہور

[2] چندر بھان برہمن لاہوری جس کا کلام اپنے زمانے کی عام روش سے اس قدر مختلف تھا کہ اُس دور کے تذکرہ نگاروں نے اُسے درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا اور آج کے نقّاد اور تذکرہ نگار اُسے آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

مولد و منشائے رونی[1] مسکنِ مسعود سعد[2]

عظمتیں یہ کون سمجھے گا اب اِس کافر کے بعد

---

[1] ابوالفرج رونی ۔ فارسی کا صاحبِ دیوان شاعر جس کے متعلق عوفی نے لکھا ہے، کہ "مولد و منشائے او خطۂ لاہور بودہ"

[2] مسعود سعد سلمان لاہوری، جس نے نیشاپور جاکر لاہور کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے

اے لاہور ویحک بے من چگونہ | بے آفتابِ تاباں، روشن چگونہ؟
اے آنکہ باغِ طبعِ من آراستہ ترا | بے لالہ و بنفشہ و سوسن چگونہ؟
تو مرغزار بودی و من شیرِ مرغزار | با من چگونہ بودی و بے من چگونہ؟
ناگہ عزیز فرزند از تو جدا شدہ است | با درد او بہ نوحہ و شیون چگونہ؟
نفرستی ام پیام و نگوئی بہ حسنِ عہد | کاندر حصارِ بستہ چو بیژن چگونہ؟
اے دم گرفتہ زنداں گشتہ مقامِ تو | بے در گشادہ طارم و گلشن چگونہ؟

جنتِ دیگر جسے نورِ جہاں کہتی رہی[3]!

جس کی دنیا کو وہ اکثر اپنی جاں کہتی رہی

پیرِ مشرق نے بسر کی جس میں ساری زندگی

پیرِ مشرق وہ سراپا پیکرِ تابندگی

جس کی بادِ صبح میں پنہاں ہے تاثیرِ شراب

جس کے ذرّوں میں نہاں ہے بجلیوں کی آب و تاب

جس کا ہر ذرّہ مرے جذبات کی تصویر ہے

جس کے ہر ذرّے پہ میرے نام کی تحریر ہے

آج اُس لاہور کی راہوں پہ ہیں میرے قدم

اے دلِ سوزاں تری آہوں پہ ہیں میرے قدم

لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم

جاں دادہ ایم و جنتِ دیگر خریدہ ایم (ملکۂ نورجہاں)

اشعار

لاہور میں کہے گئے

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایّامِ بہاراں لے کے آیا ہوں

تری محفل سے جو ارمان و حسرت لے کے نکلا تھا
وہ حسرت لے کے آیا ہوں وہ ارماں لے کے آیا ہوں

تمھارے واسطے اے دوستو! میں اور کیا لاتا
وطن کی صبح تک شامِ غریباں لے کے آیا ہوں

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

نگاہوں میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن
تفکّر میں جمالِ صبحِ تاباں لے کے آیا ہوں
سوا اس کے اب اے آزاد! میرا بس کہاں تک ہے
اندھیری رات میں ذکرِ چراغاں لے کے آیا ہوں

لاہور میں ایک لمحہ

ظلمتوں کی ہے کارفرمائی
جلوہ آرا کہیں بھی نور نہیں
چاند تاروں کا ذکر ہی کیا ہے
ایک جگنو کا بھی ظہور نہیں
پھر بھی مجھ کو گماں یہ ہوتا ہے
تو مری دسترس سے دور نہیں

غزل

عشق کس سمت رواں ہے مجھے معلوم نہیں
منزلِ دوست کہاں ہے مجھے معلوم نہیں

کوئی احساس کو آواز تو دیتا ہے مگر
کون ہے اور کہاں ہے مجھے معلوم نہیں

دل کی دنیا میں کوئی زمزمہ خواں ہے تو سہی
کون یہ زمزمہ خواں ہے مجھے معلوم نہیں

اس قدر علم ہے جلوہ دل میں نہاں ہے کوئی
کون جلوہ دل میں نہاں ہے مجھے معلوم نہیں

محوِ گفتار تو ہے روح کا ہر تار مگر!
یہ نوا ہے کہ فغاں ہے مجھے معلوم نہیں

زیارت گاہِ اہلِ عزم وہمّت ہے لحد میری

مزارِ اقبال پر

السّلام اے شاعرِ روشن ضمیر
کاروانِ فکرِ تاباں کے امیر
السّلام اے محرمِ رازِ حیات
السّلام اے شاعرِ والاصفات
زندگی کے معرکے میں سخت کوش
حرّیّت کی بزم کے پیمانہ نوش

آشنائے ہر ثبات و بے ثبات
واقفِ سِرِّ مقاماتِ حیات
اے ترے دل میں مثالِ لالہ داغ
اے مری راتوں میں مانندِ چراغ
سینۂ مشرق کے اے قلبِ سلیم
جادہ پیمائے صراطِ مستقیم
فاش یوں تو نے کیا رازِ فرنگ
خاوراں نے تجھ سے پایا آب و رنگ
ہائے وہ تیری نوا کا ارتعاش
شیشۂ مغرب ہے جس سے پاش پاش
تجھ سے ہے روشن شب افکارِ شرق
اے فروغِ سینۂ اسرارِ شرق

دیکھ مجھ کو اور سراپا نور کر
پردۂ انوار میں مستور کر

نوائے اقبال

"لالۂ ایں چمن آلودۂ رنگ است ہنوز
سپر از دست میندازکہ جنگ است ہنوز
فتنۂ را کہ دو صد فتنہ بہ آغوشش بود
دُخترے ہست کہ در عہدِ فرنگ است ہنوز
اے کہ آسودہ نشینی لبِ ساحل برخیز
کہ ترا کار بہ گرداب و نہنگ است ہنوز
از سرِ تیشہ گزشتن زخردمندی نیست
اے بسا لعل کہ اندر دلِ سنگ است ہنوز"

آزاد کا خطاب اقبال سے

یہ راز میری نگاہوں پہ فاش ہو نہ سکا
کہ خاک سے تھا کہ افلاک سے ترا پیوند
تری نگاہ گئی بزمِ کہکشاں سے پرے
وجود اگرچہ رہا بزمِ خاک کا پابند
مہ و ستارہ و برقِ طپاں و مہرِ مبیں
تری نگاہ نے ڈالی کہاں کہاں نہ کمند
ریاضِ شعر و گلستانِ فلسفہ کے لیئے
ترا نفس تھا نسیمِ بہار کی مانند
ترے کلام کی گرمی سے ہو گئے بیتاب
وہ جن کے فکر و نظر پہ عمل کی راہ تھی بند

"جو کوکنار کے خُوگر تھے اُن غریبوں کو!

تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند

تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے

وہ پر شکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خورسند"

نوائے اقبال

"مری نوا سے گریبانِ لالہ چاک ہوا

نسیمِ صبحِ چمن کی تلاش میں ہے ابھی

نہ مصطفٰے نہ رضا شاہ میں نمود اس کی

کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

مری نوا بھی سزا کی ہے مستحق لیکن

زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی"

شعرِ آزاد

قرار پا نہ سکا آج تک دلِ آزاد
کچھ ایسے سوز سے معمور تھی تری فریاد
اگرچہ خاک کا پیکر وجود تھا تیرا
ترا وجود رہا جذبِ خاک سے آزاد
ترا نفس چمنِ فلسفہ کو مثلِ نسیم
تری نگاہ سے کاشانۂ سخن آباد
سکونِ صبح میں پایا ہے میں نے دل کا حضور
ترے کلام میں پائی ہے میں نے دل کی کشاد
ترے حقائق روشن ہیں بے نیازِ دلیل
ترے نکاتِ خودی ہیں بہت جلیل و جمیل

تری نظر سے حسیں تر چمن میں لالہ و گل

تری نوا سے رواں تر فرات و دجلہ و نیل

فضائے عالمِ اردو میں یوں ہی شعر ترے

ہو جس طرح سے بیابان میں ہجومِ نخیل

ترا کلام مری جانِ مضطرب کا قرار

ترا کلام مرے وہم کو پیامِ رحیل

ترے کلام کو دل معجزہ سمجھتا ہے

کثیر جس کے معانی ہیں اور لفظ قلیل

اندھیری شب ہے جُدا اپنے قافلے سے ہوں میں[ا]

مرے لئے ہے ترا شعلۂ نوا قندیل

ا اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو

ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل (اقبال)

نوائے اقبال

"دو عالم را تواں دیدن بہ مینائے کہ تو داری
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ تو داری
دگر دیوانہ آید کہ در شہر افگند ہوئے
دو صد ہنگامہ برخیز د ز سودائے کہ تو داری[1]"

---

[1] حضرت اقبالؒ کے ان اشعار میں ذرا سا لفظی تغیر کیا گیا ہے۔

لاہور سے لائل پور جاتے ہوئے

رُباعی

طوفاں سا روح میں اُٹھاتی ہوئی آئیں
احساس میں نشتر سے چلاتی ہوئی آئیں
بچھڑے ہوئے احباب کی پیاری یادیں
پھر آج مرا درد بڑھاتی ہوئی آئیں

غزل

دردِ حیات! تیرے فسانے کہاں گئے
دل جن سے زندہ تھا وہ ترانے کہاں گئے

جن سے تھا زندگی میں نہاں کیفِ زندگی

وہ لوگ کیا ہوئے وہ زمانے کہاں گئے

اے دستِ بُردِ گردشِ ایّام کچھ تو کہہ

پنہاں دلوں میں تھے جو خزانے کہاں گئے

سینوں کو اور اُن کے دفینوں کو کیا ہوا

اخلاص اور اُس کے ٹھکانے کہاں گئے

یکسر شمیمِ صدق وصفا میں بسے ہوئے

وہ ایک سادہ دل کے بہانے کہاں گئے

جن کے طفیل باغ و بہاراں تھی زندگی

وہ دوست وہ حبیب نہ جانے کہاں گئے

ملتا نہیں چمن میں کہیں اُن کا اب نشاں

اے بجلیو! تمھارے نشانے کہاں گئے

لائل پور میں مشاعرہ

شعرِ آزاد

"مرا معنیِ تازۂ مدّعا است
اگر گفتہ را باز گویم رواست"

یوں گلستاں میں آئی بادِ نسیم
ہمصفیروں کا ساتھ چھوٹ گیا
میں نے پوچھا جو زندگی کیا ہے
ہاتھ سے گر کے جام ٹوٹ گیا
نو بہاروں کی جب دعا مانگی
گلستاں کا نصیب پھوٹ گیا

جشنِ آزادی

مجھے کیا پھر نویدِ جشنِ آزادی سناتے ہو
ابھی تک میں وہ پہلا جشنِ آزادی نہیں بھولا
چمن کو باغباں کے ہاتھ میں تم دیکھ کر خوش ہو
مگر میں اختتامِ دورِ صیّاد ی نہیں بھولا

نہیں بھولا ابھی تک میں چمن زاروں پہ کیا گذری
چمن زاروں میں جب آزاد ہنگامِ بہار آیا
گرا پتھر کی صورت خاک پر ہر قطرۂ باراں
ہر اک جھونکا صبا کا مثلِ تیغِ آبدار آیا

نشیمن جل اُٹھے شاخیں گریں اشجار سے کٹ کر
چمن اندر چمن اک آتشیں رَو چل گئی گویا
خلوص و صدق پر تھی بزمِ اربابِ چمن قائم
وہ بنیادیں ہلیں یکسر وہ محفل جل گئی گویا

اِدھر صیّاد پھرتے تھے اُدھر صیّاد پھرتے تھے
کچھ اس انداز سے میرے گلستاں میں بہار آئی
اِدھر بھی آگ بھڑکی تھی اُدھر بھی آگ بھڑکی تھی
زمینِ باغ پر یوں رحمتِ پروردگار آئی

ہوا جب دور برسوں کا اندھیرا اپنی دنیا سے
افق پر ہمنشیں جس صبح کو تازہ کرن پھوٹی

نہ جانے وہ کوئی مسعود یا منحوس ساعت تھی
کہ تدبیرِ وطن جاگی تو تقدیرِ وطن پھوٹی

نظامِ زندگانی میں کچھ ایسا انقلاب آیا
مکانوں کے مکیں بدلے مکینوں کے مکاں بدلے
چمن والے چمن میں آبرو سے کس طرح رہتے
چمن بدلا چمن کا رنگ بدلا باغباں بدلے

ہوا یوں دم زدن میں آدمی کا آدمی بیری
مروّت ہو گئی آنکھوں سے رخصت دردمندوں سے
تسلط غیریت نے یوں جمایا بزمِ الفت پر
محبت کی جگہ نفرت برستی تھی جبینوں سے

اسی ہندوستاں میں دھرم کی مذہب کی دنیا میں
تمدّن کو جنوں کی لہر میں بہتا ہوا دیکھا
معین الدین چشتیؒ کی زمیں پر، کرشن کے گھر میں
مسرّت کو الم کی داستاں کہتا ہوا دیکھا

اسی پنجاب میں جس کی محبت کیش دنیا میں
گورو نانک نے اپنے دلنشیں نغمات برسائے
کئے بڑھ بڑھ کے افعالِ زبوں وہ ابنِ آدم نے
درندوں کو تو کیا ابلیس کو بھی جن پہ شرم آئے

وہی بنگال گونج اٹھا جنوں انگیز نعروں سے
ترانے پیار کے قاضی جہاں گاتا رہا برسوں

اُسی کی سرزمیں پر خونِ انساں کی ہوئی بارش
جہاں جامِ وفا ٹیگور چھلکاتا رہا برسوں

بھڑکتی آگ دیکھی ہر جگہ کٹتے بشر دیکھے
غضب تھا اشرف المخلوق کا جذبِ بہیمانہ
لہو کی ندّیوں میں ہر طرف بہتی ہوئی دیکھی
حقیقت وہ کہ جس سے مات کھا جائے ہر افسانہ

اشارہ غیر کا تھا ہمّت اپنی تھی ہوس اپنی
دکھائے واہ کیا تیور وطن کے خوش خصالوں نے
جہالت کی سیاہی چہرۂ تہذیب پر مل دی
نئی تاریخ یوں لکھّی وطن میں لکھنے والوں نے

ابھی چھوٹے بڑے سارے مناظر یاد ہیں مجھ کو
ابھی تک دیدۂ حیراں میں پھرتی ہیں یہ تصویریں
ابھی تک یاد ہیں وہ جشنِ آزادی کے نظّارے
وہ منظر یاد ہے ٹوٹی تھیں جب برسوں کی زنجیریں

مجھے کیا پھر نویدِ جشنِ آزادی سناتے ہو!
ابھی تک میں وہ پہلا جشنِ آزادی نہیں بھولا
چمن اہلِ چمن کے ہاتھ میں تم دیکھ کر خوش ہو
مگر میں اختتامِ دورِ صیادی نہیں بھولا

شایاں ہے مجھے غمِ جدائی
یہ خاک ہے محرمِ جدائی

اقبال

نوائے پریشاں

ردِ عمل

راولپنڈی سے دعوت آنے پر
قیامِ لاہور کے دوران میں

غم گساروں نے تجھے یاد کیا ہے آزاد
تیرے پیاروں نے تجھے یاد کیا ہے آزاد
جن اشاروں پہ رہی رقص میں لیلائے حیات
اُن اشاروں نے تجھے یاد کیا ہے آزاد

تجھ کو اک بار گنشوا کر جو پریشان رہیں
اُن بہاروں نے تجھے یاد کیا ہے آزاد

تیرے جذبات کی رفتار کو مدھم پا کر
مے گُساروں نے تجھے یاد کیا ہے آزاد

جن کی ضو سے ہیں تری آج بھی راتیں روشن
اُن ستاروں نے تجھے یاد کیا ہے آزاد

منتظر ہے وہ تری ریل بھی طیّارہ بھی
تیرے پیاروں نے تجھے یاد کیا ہے آزاد

مجبوری

تجھ پہ اے دورِ سیاست! آفریں صد آفریں
اک مسافر آج اپنے گھر میں آسکتا نہیں

جس سے ملنے کے ہے ایک دنیا بے قرار

آج وہ اپنا قدم آگے بڑھا سکتا نہیں

جو فضائیں منتظر ہیں اُس کے نغموں کے لئے

اُن فضاؤں میں یہ اب نغمے لٹا سکتا نہیں

اُس کی موجِ نطق کی ہے جس زمیں کو آرزو

اب وہاں یہ نطق کا دریا بہا سکتا نہیں

جس چمن میں اُس نے سیکھا بات کرنے کا طریق

اُس چمن میں جا کے اب یہ گیت گا سکتا نہیں

اے عدم! اے فطرت! اے مختار! اے اشک! اے کلیم!

دیکھ لو آزاد اپنے گھر میں آ سکتا نہیں

اے قتیل! اے حیدری! اے سائل! اے ذکر! اے نسیم!

آپ بیتی آج میں تم کو سنا سکتا نہیں

یہ حجابِ درمیاں، وہمی حجابِ درمیاں
وائے مجبوری کہ میں اس کو اُٹھا سکتا نہیں

گارڈن کالج کی اے محبوب دنیائے جمیل!
یہ حقیقت ہے کہ میں تجھ کو بھلا سکتا نہیں

لیکن ان پابندیوں مجبوریوں کا کیا علاج
میں اگر چاہوں تو تیرے پاس آ سکتا نہیں

پتھروں سے سر پٹکتی جوئبارِ دل نشیں!
گرچہ میں گزرے زمانے کو بُلا سکتا نہیں

یہ مگر دل میں نہ لانا ایک پل کو بھی خیال
اب ترا نغمہ مرے کانوں تک آ سکتا نہیں

پتھروں اور درختوں کے جہانِ کیف و کم
میں ترا ماحول دنیا بھر میں پا سکتا نہیں

کتنی صبحیں میری دامن میں ترے شامیں ہوئیں
آج اک لمحے کو تیرے پاس آ سکتا نہیں

ہائے یہ مجبوریاں، پابندیاں، لاچاریاں
عشق صادق ہو تو یہ ذلت اُٹھا سکتا نہیں

کس طرح آزاد یہ صورت گوارا ہو مجھے!
آج میں لاہور سے پنڈی کو جا سکتا نہیں

یادِ مری

دامن سے ترے گرچہ بہت دور رہوں لیکن
نظروں میں ہیں اے کوہ مری تیرے نظارے

سبزے کا ہر اک کنج میں وہ فرشِ زمرد
وہ عرش پر اُڑتے ہوئے پُر نور غبارے

تھا باعثِ بے تابیِ دل منظرِ باراں
ہر سمت وہ بہتے ہوئے سیماب کے دھارے
افلاک کی رفعت پہ وہ اُڑتے ہوئے بادل
بادل کی رداؤں میں وہ پوشیدہ ستارے
راہوں میں سرِ شام سے وہ قمقمے روشن
گویا کہ اُتر آئے ہیں گردوں سے ستارے
غاروں کا وہ عمق اور وہ کہسار کی رفعت
پستی و بلندی کے ہم آغوش نظارے
وہ کیف فضا میں تھا کہ بے خود ہوں ملائک
وہ حسن تھا ذروں میں کہ شرمندہ ہوں تارے
جو عشرتِ نظارہ سنی بینک پہ دیکھی
ستلج کے کنارے ہے نہ جمنا کے کنارے

دیکھے ہوئے مدت ہوئی ان کو مگر اب تک

آنکھوں میں ہیں گھنگھور گھٹاؤں کے نظارے

حیراں ہے مری عقل کہ کس کس کو گنے اب

جتنے بھی نظارے تھے دلاویز تھے سارے

وہ چاند وہ سورج وہ ستارے وہ گھٹائیں

جاں پرور و دلکش تھے مری تیرے نظارے

راولپنڈی کے نام

آزاد کا پیغام

رُباعی

ہر نغمۂ نو خوشی کا پیغام نہیں
ہر بزمِ طرب نشاط انجام نہیں
ہر روئے حسیں نہیں ہے تابانیِ صبح
ہر زُلفِ دراز سایۂ شام نہیں

قطعہ

آمدِ بہار کا سماں نہ پوچھ
گلستاں کے گلستاں اُجڑ گئے
زندگی سے زندگی جدا ہوئی
قافلوں سے قافلے بچھڑ گئے

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پہ
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

شاد عظیم آبادی

نئی منزل

قطعہ

کلکتے سے ڈھاکہ جاتے ہوئے

گم ہے خاموشی کی دنیا انجنوں کے شور میں
تیز طیّارہ رواں ہے بادلوں کے دوش پر
شور کے باوصف تیرے زمزموں کی یاد سے
بارشِ نغمات ہے میرے دلِ خاموش پر

ڈھاکے میں پہلی صبح

افق کے گلرنگ بادلوں سے طلوعِ خورشید کا نظارہ
جنوں کو حیرت ہے عقل گم ہے نظر کا دامن ہے پارہ پارہ

افکارِ پریشاں

ڈھاکے سے چٹاگانگ جاتے ہوئے

اغیار سے گلے کا شکایت کا کیا سوال
احباب سے بھی اب تو نہیں ہے گلہ مجھے
اب بزمِ رنگ و بُو میں نظر کو نہیں قرار
بخشا گیا یہ ذوقِ نظر کا صلہ مجھے

بھٹکا ہوں راستے سے مگر اب بھی ہے یقیں
اک روز ڈھونڈ لے گا مرا قافلہ مجھے

دشتِ جنوں میں رُک بھی کہیں اے خیالِ دوست
لے جائے گا کہاں یہ ترا سلسلہ مجھے

منزل کی راہ پر یہ ہجومِ نشاط و کیف
ڈرتا ہوں روک لے نہ کوئی مرحلہ مجھے

چٹاگانگ

اے چٹاگانگ اے دیارِ پاک کی خلدِ بریں
اے سمندر کے کنارے کی فضائے دلنشیں
خاک[1] کے سرسبز کہساروں کی دنیائے جمیل
صانعِ روزِ ازل کی ایک تعمیرِ جلیل
دل رُبا پودوں کی بہتے پانیوں کی سرزمیں
آب و گِل کی پے بہ پے جولانیوں کی سرزمیں

---

[1] چٹاگانگ میں یہ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ یہاں کے پہاڑوں میں پتھر نام کو موجود نہیں بلکہ مٹی کی سربلندی اور پختگی نے پہاڑوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

پرسکوں صبحوں کے راحت خیز شاموں کے وطن

خلد سے سوئے زمیں آتے پیاموں کے وطن

اے گھٹاؤں کے تموّج ریز طوفاں کے دیس

میرے دل میں ہیں جو خوابیدہ اُن ارمانوں کے دیس

مثلِ بیگانہ ترے ماحول میں آیا ہوں میں

ہدیۂ اخلاص چشمِ شوق میں لایا ہوں میں

چار جانب کیف برساتی ہواؤں کے وطن

وجد آور زندگی پرور گھٹاؤں کے وطن

عالمِ شعلہ بہ پیراہن میں اک بزمِ سکوں

تیرے ذرّوں میں ہے خوابیدہ محبّت کا فسوں

روح میری ہے نئے عالم سے گھبرائی ہوئی

عقل ہے دنیا کے نظّاروں سے چکرائی ہوئی

وہ خموشی حکمراں ہے جو تری دنیا پہ آج
عالمِ مستی رواں ہے جو تری دنیا پہ آج
وہ سکوں جو ہے ترے ماحول پر چھایا ہوا
لمحہ لمحہ جس کے ہے زیرِ طلسم آیا ہوا
بخش دے ممکن اگر ہو وہ سکونِ دل مجھے
تو نظر آتا ہے طوفانوں میں اک ساحل مجھے
دیکھ اے آزاد! اس تصویر کا پہلا ہی رنگ
خاک سے افلاک تک پھیلی ہے مستی کی ترنگ
دیکھ گرد و پیش کو زیرِ نگیں لاتی ہوئی
وہ گھٹا اُٹھی سرور و کیف برساتی ہوئی
مست ناگن کی طرح پھنکارتی کالی گھٹا
اپنی مستی کے نشے میں غرق متوالی گھٹا

یہ گھٹا ہے یا سمندر آسماں پر جم گیا
یا مرا حسنِ تخیل ایک پل کو تھم گیا
ہائے یہ کالی گھٹا اس میں یہ کوندے کی لپک
ہجر کی راتوں میں جیسے درد کی میٹھی کسک
یہ بھری برسات کے موسم کی اک تاریک رات
کھلتے جاتے ہیں یکایک روح پر کتنے نکات
رات کا یہ جاگتا انداز یہ لہجہ یہ چال
لمحہ لمحہ اک اشارہ لحظہ لحظہ اک خیال
یہ مرا دل اپنے درد و غم سے ہی جو سرگراں
بن رہا ہے خود بہ خود ہی راز بین و راز داں
کس لئے مجھ کو سمجھ کر محرمِ سرو و سمن
آج محوِ گفتگو ہیں مجھ سے ذراتِ چمن

اللہ اللہ رات کے عالم کا یہ سوز و گداز
مجھ سے باتیں کر رہا ہے پھول کی کلیوں کا ساز

کہہ رہا ہے اے مسافر! اے وطن میں بے وطن
اے کہ جذبِ دل سے ہے خلوت میں تو اک انجمن

اس فضا میں کیوں ہے تیری روح کو یہ خلفشار
چشمِ بینا ہو تو یہ ظلمت ابھی ہو نور بار

دیکھ اس کالی گھٹا میں بجلیوں کا رنگ ڈھنگ
زندگی برسا رہی ہے نور اور ظلمت کی جنگ

تیرا سینہ شعر کی دولت سے ہے جب بہرہ مند
کس لیے باطل پہ تیری آنکھ ہے ماتم پسند

کیوں حوادث دیکھ کر دنیا کے تو ہے مضمحل
اے کہ کرنا ہے تجھے تزئینِ بزمِ آب و گل

اے کہ ہیں نظریں تری مشتاقِ راہِ مستقیم

کس لیئے ہے دل ترا واماندۂ امید و بیم

کس لیے آنکھوں میں تیری اشک ہیں دل میں قلق

تجھ کو تو انساں کو دینا ہے شجاعت کا سبق

تا بہ کے تیری نظر پر نا امیدی کے حجاب

اے کہ تیری فکر میں غلطاں ہیں لاکھوں آفتاب

دیکھ کر دنیا کا عالم ہو گیا افسردہ تو

فکر کی تابندگی اے شاعری کی آبرو

تجھ پہ اے فن کار مایوسی کا عالم ہے حرام

اے کہ تیرے شعر میں پنہاں ہے فردا کا نظام

اک تعجب ہے کہ تیری روح اور اتنی ملول

اے کہ کانٹوں کو بنانا ہے تجھے شاداب پھول

بادلوں میں برق ہے تو سوزِ ایماں کی قسم
تو ہے اک روشن ستارہ دردِ انساں کی قسم
تیری جانب کیا بڑھے گی خنجرِ باطل کی دھار
اے کہ تجھ پہ فاش ہے رازِ حیاتِ پائیدار
برق کی تابندگی بادل سے ڈر سکتی نہیں
ظلمتوں سے روشنی تارے کی مر سکتی نہیں
بادلوں میں صورتِ اختر دمکنا ہو جسے
برق کی صورت گھٹاؤں میں چمکنا ہو جسے
اس کو دنیا کے اندھیرے سے نہ ڈرنا چاہیئے
شعلہ بن کر بلکہ ظلمت سے گزرنا چاہیئے

چٹاگانگ میں چند دن

ایک ملاقات

چاٹ گاؤں کی فضائے دلنشیں
دم سے اظہر کے تھی فردوس بریں
صبح تھی اس شہر کی صبحِ نشاط
اور تھی ہر شام، شامِ انبساط
ننھے ننھے کوہساروں کا سماں
کوہساروں پر بہاروں کا سماں

وہ تہیں سبزے کی تا حدِّ نظر
زندگی گم تھی یہ منظر دیکھ کر
ہر طرف اشجار جیسے پاسباں
پتّہ پتّہ اک انوکھی داستاں
ذرّے ذرّے پر نکھار آیا ہوا
چار جانب حسن لہرایا ہوا
اور وہ اے دل! کنارا بحر کا
ایک جادو تھا نظارا بحر کا
ریت کی دُنیا کنارِ بحر پر
وجد میں ہے آج تک ذوقِ نظر
شب کی ظلمت میں سمندر کا فسوں
ہائے ان لمحوں کا عالم کیا کہوں

ڈور سے بحری جہاز آتے ہوئے
ظلمتوں میں نور برساتے ہوئے
عالمِ ظلمات میں پلتے ہوئے
روشنی کے کارواں چلتے ہوئے
ہر قدم پر نغمہ خواں افسانہ خواں
جیسے پریوں کے جزیرے ہوں رواں
سرخوشی کی رو میں لہراتی ہوئی
جا رہی تھی زندگی گاتی ہوئی
دل خیالِ درد و غم بھولا ہوا
ذوقِ نظّارہ الم بھولا ہوا
کب گوارا تھا مقدّر کو مگر
دل ہو رقصاں سرخوشی کے ساز پر

ان مسرّت بیز لمحوں میں کہیں
کیف سے لبریز لمحوں میں کہیں
ایک لمحہ غم کا بھی پوشیدہ تھا
اک عجب انداز سے خوابیدہ تھا
ہو گیا بیدار وہ اک شام کو
لے گیا تسکین کو آرام کو
زیست کے لب سے تبسّم لے گیا
نطق سے شوقِ تکلّم لے گیا
شاعرِ شیریں بیانِ ہند و پاک
جس کی لے سے سینۂ گُل چاک چاک
مل رہا تھا مجھ سے اک مُدّت کے بعد
کس قدر غم ناک تھا یہ وقتِ سعد

کیا کہوں کیا تھی ملاقاتِ حفیظ
غم کی دنیا تھی ملاقاتِ حفیظ
ہائے دردِ بیکرانِ زندگی
تھا سکوت افسانہ خوانِ زندگی
میں نے آخر توڑ کر مہرِ سکوت
یوں دیا اپنی جسارت کا ثبوت

آزاد کا خطاب حفیظ سے

ہند و پاکستان کے اے شاعرِ جادو بیاں
آج کس عالم میں ہے نغمہ تراتیری فغاں
ایک مدت سے تری آواز سے بیگانہ ہے
دل مرا تیری نوائے ساز سے بیگانہ ہے

اے شہیدِ نغمہ اے جاں دادۂ ذوقِ سخن
آج میں بھی بے وطن ہوں اور تو بھی بے وطن
مجھ تک آئی ہے درد و الم کی داستاں
شاعرِ شیریں مقال اے یوسفِ بے کارواں
سن چکا ہوں اپنے کانوں سے میں جالندھر کا حال
جانتا ہوں کیا ہوا تیرے گھرانے کا مآل
داستاں جیسے بھی ہو گزری وہ سب معلوم ہے
تیرے گھر والوں پہ جو گزری وہ سب معلوم ہے
اے سراپا درد! اے فن کار! تیرے شعر پر
کچھ تو کہہ آخر ہوا کیا ان حوادث کا اثر
کیا کہوں کھویا ہوا ماحول پانے کے لئے
کس قدر بیتاب ہوں تیرے ترانے کے لئے

سیدھی سادی گفتگو میری تصنّع سے بری
خرمنِ ضبط و سکوں کے حق میں بجلی بن گئی
کیا خبر کتنے نظارے تھے کہ جو لہرا گئے
شاعرِ حسّاس کی آنکھوں میں آنسو آگئے
ہر نظر میں درد و غم کے کارواں چلنے لگے
دل میں تھے جو بند طوفاں شعر میں ڈھلنے لگے
دفعتہً پیدا ہوا ساکن فضا میں ارتعاش
شیشۂ صبر و سکوں ہونے لگا یوں پاش پاش

شعرِ حفیظ

"یہ کیا مقام ہے وہ نظارے کہاں گئے
وہ پھول کیا ہوئے وہ ستارے کہاں گئے

افتاد کیوں ہے لغزشِ مستانہ کیوں نہیں
وہ عذرِ میکشی کے سہارے کہاں گئے

یارانِ بزم جراتِ رندانہ کیا ہوئی
اُن مست انکھڑیوں کے اشارے کہاں گئے

ہر میرِ کارواں سے مجھے پوچھنا پڑا
ساتھی مرے کدھر کو سدھارے کہاں گئے

اُٹھ اُٹھ کے بیٹھ بیٹھ چکی گردِ راہ کی
میرے وہ قافلے تھکے ہارے کہاں گئے

تم سے بھی جن کا عہدِ وفا استوار تھا
اے دشمنو! وہ دوست ہمارے کہاں گئے

اب ڈوبتوں سے پوچھتا پھرتا ہے ناخدا
جن کو لگا چکا ہوں کنارے کہاں گئے

کشتی نئی بنی کہ اُٹھائے گیا کوئی
تختے جو لگ گئے تھے کنارے کہاں گئے "

حفیظ کے اشعار محروم تک

مجھ تک ہی رُک سکا نہ فسانہ حفیظ کا
پہنچا بہت ہی دور ترانہ حفیظ کا
اشعار یہ کہ وقت کی موجوں پہ تھے رواں
محروم تک بھی آ ہی گئی ان کی داستاں
چھیڑا جو اپنا راگ دلِ دردمند نے
اپنا لیا اُسے نگہِ غم پسند نے
اب آ گئی غزل جو مخمّس کے روپ میں
چمکی کچھ اس طرح سے محبت کی دھوپ میں

حفیظ کی غزل پر محروم کی تضمین

دریائے انبساط کے دھارے کہاں گئے
دل جن سے لے رہا تھا ابھارے کہاں گئے
منظر دل و نظر کے وہ پیارے کہاں گئے
یہ کیا مقام ہے وہ نظارے کہاں گئے
وہ پھول کیا ہوئے وہ ستارے کہاں گئے

اب دل رہینِ منّتِ میخانہ کیوں نہیں
محفل میں ذکرِ شیشہ و پیمانہ کیوں نہیں
مشتاقِ ہائے وہو دلِ دیوانہ کیوں نہیں
افتاد کیوں ہے لغزشِ مستانہ کیوں نہیں
وہ عذرِ مے کشی کے سہارے کہاں گئے

افسردہ خاطری کی کہاں ابتدا ہوئی
کیا ہو گیا کہ گرمیٔ محفل فنا ہوئی
بیگانہ کس طرح نگہِ آشنا ہوئی
یارانِ بزم جرأتِ رندانہ کیا ہوئی
اُن مست انکھڑیوں کے اشارے کہاں گئے

آخر زمیں زماں سے مجھے پوچھنا پڑا
ہر منزل و نشان سے مجھے پوچھنا پڑا
سب سے یہاں وہاں سے مجھے پوچھنا پڑا
ہر میرِ کارواں سے مجھے پوچھنا پڑا
ساتھی ترے کدھر کو سدھارے کہاں گئے

سنسان تھیں فضائیں جدھر کو نگاہ کی
آئی خبر کسی کے نہ حالِ تباہ کی
مٹی خراب ہو بھی چکی اشک و آہ کی
اُٹھ اُٹھ کے بیٹھ بیٹھ چکی گرد راہ کی

میرے وہ قافلے تھکے ہارے کہاں گئے

آسودہ جن کے دم سے دلِ بے قرار تھا
جن کا فراق ہم کو بہت ناگوار تھا
آخر کوئی تو اِن میں تمہارا بھی یار تھا
تم سے بھی جن کا عہدِ وفا استوار تھا

اے دشمنو! وہ دوست ہمارے کہاں گئے

منجدھار میں جو دیدہ و دانستہ لے گیا
بیڑا کرم سے جس کے غریقِ فنا ہوا
ایسے ستم ظریف کو کہیے بھی کچھ تو کیا
اب ڈوبتوں سے پوچھتا پھرتا ہے ناخدا
جن کو لگا چکا ہوں کنارے کہاں گئے

شغلِ شکست و ریخت سے کیا لے گیا کوئی
ہاں داغِ انتقامِ وفا لے گیا کوئی
کشتی شکستگاں کی دعا لے گیا کوئی
کشتی نئی بنی کہ اُٹھا لے گیا کوئی
تختے جو لگ گئے تھے کنارے کہاں گئے

مشرقی بنگال

چٹاگانگ سے واپس جاتے ہوئے

مری نگاہ میں پوشیدہ ہے پیام مرا
مرے وطن کے حسیں جزو لے سلام مرا
ہے پاک و ہند میں یکسر یگانہ تیری فضا
کہ مستیوں کے لیئے ہے بہانہ تیری فضا
ہوائیں سحر ہے ذرّوں میں ہے طلسم نہاں
نشاطِ روح ہے تیری فضاؤں میں رقصاں

بہشتِ زیست کا در ہے تری فضائے جمیل
سکون و امن کا گھر ہے تری فضائے جمیل
مگر یہ کتنی بڑی تیری بدنصیبی ہے
تری نہیں یہ فقط میری بدنصیبی ہے
کہ تو بھی بچ نہ سکا شر پسند ارادوں سے
تری زمیں بھی ملوّث ہوئی فسادوں سے
وطن کہوں میں تجھے یہ تو ہو نہیں سکتا
کہے تو اپنا مجھے یہ تو ہو نہیں سکتا
دیارِ غیر بھی تجھ کو نہ میں کہوں گا مگر!
ترے جمال پہ قرباں مرا مذاقِ نظر
مرے وطن سے جو باندھا ہے سلسلہ تو نے
مٹا دیا ہے من و تو کا مرحلہ تو نے

تری فضائیں بھی آوارہ ہے وہ موجِ بہار
ریاضِ کشورِ پنجاب میں جو ہے گل کار

فروغِ شفق سے تیری فضا بھی تاباں ہے
تری جبیں سے بھی ذوقِ وفا نمایاں ہے

خلوصِ دل سے ترا احترام کرتا ہوں
جہاز پر سے تجھے میں سلام کرتا ہوں

مرے وطن کے بڑے جزو! الوداع تجھے
مرے چمن کے بڑے جزو! الوداع تجھے

چمک رہا ہے جلندھر کے دم سے نام ترا
ہے پاک و ہند میں اونچا بہت مقام ترا

دیا بیاس ہے تو سرزمینِ حسین ہے تو
کہ حریت کے شہیدوں کا نورِ عین ہے تو

سراجِ دولہ غازی وطن کا وہ جانباز

وہ حرّیت کا، صداقت کا، جہد کا دمساز

ترے ہی شعلے سے ٹوٹا ہوا شرارہ تھا

ترے ہی چرخ کا اک تابناک تارہ تھا

اگرچہ تجھ سے میں کوئی گلہ نہیں کرتا

لبِ شکایت و شکوہ کو وا نہیں کرتا

وہ ایک بات جو دل میں ہے کہہ نہیں سکتا

کہے بغیر بھی لیکن میں رہ نہیں سکتا

ترے چمن میں بھی مجھ کو قیام مل نہ سکا

کہیں بھی غنچہ مری آرزو کا کھل نہ سکا

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

اقبال

راولپنڈی میں چند لمحے

یہ تنہائی کا عالم ڈوبتے تاروں کی خاموشی
بتا اے جذبۂ دل اس وقت کتنی رات باقی ہے

شہرِ پنڈی میں جونہی آزاد ! جا پہنچے قدم
کیا بتاؤں اپنے دل کے ولولوں کا زیر و بم
دے گئی گفتار کو گفتار کی طاقت جواب
انقلاب ! اے انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

دیکھ کر اپنے بیان و نُطق کو بے ماجرا

پیرِ رومی کا لیا میری زباں نے آسرا

ہر نَظَر درد و الم کی داستاں ہونے لگی

ایک مُدّت کی کہانی یوں بیاں ہونے لگی

"بشنو از نَے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند

از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق

تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش

باز جوید روزگارِ وصلِ خویش"

راولپنڈی کی آواز

جن فضاؤں میں گزارا ہے لڑکپن تونے
وہ فضائیں ہیں تری یاد میں بیتاب ابھی
جن ہواؤں نے ترے ذوقِ سخن کو پالا
وہ ہوائیں ہیں تری یاد میں بیتاب ابھی
جن گھٹاؤں نے مئے شعر پلائی تجھ کو
وہ گھٹائیں ہیں تری یاد میں بیتاب ابھی
ماجرائے دلِ بیتاب سُنا کچھ اُس کو
اپنے ماحول میں اے لوٹ کے آنے والے
دیکھ احباب کی آنکھوں میں مسرّت کی چمک
اپنے احباب کو دیوانہ بنانے والے

چھیڑ کچھ ذکر نئی بزم کا اے جانِ وطن
دُور پنڈی سے نئی بزم سجانے والے

شعرِ آزاد

بہارِ جانفزا آنے پہ بھی ناشاد ہوتا ہے
جسے اپنے نشیمن کا اُجڑنا یاد ہوتا ہے
چمن والے جہاں بھی ہوں ذرا دل تھام لیں اپنا
کوئی کُنجِ قفس میں مائلِ فریاد ہوتا ہے
خدا جانے یہ کس نے کہہ دیا ہے کم سوادوں سے
کہ جو تیشہ اُٹھا لیتا ہے وہ فرہاد ہوتا ہے
خزاں آنے پہ بھی جس کی خوش الحانی نہیں جاتی
حقیقت میں وہی طائر گلستاں زاد ہوتا ہے

چمن والو! سنبھل کر اس زمانے میں بسر کرنا
کہ اکثر باغباں کے بھیس میں صیاد ہوتا ہے

نہ پوچھو کیا ہے بربادی و آبادی کی نیرنگی
نظر کا قافلہ لٹتا ہے دل آباد ہوتا ہے

زمانے بھر کو جب محویتوں میں بھول جاتا ہوں
تو اک تیرے جدا ہونے کا منظر یاد ہوتا ہے

یہ دلشادی فقط دو چار پھولوں کی ہے دلشادی
کہیں اس طرح سے سارا چمن دلشاد ہوتا ہے

جہاں آکر ہوس والوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں
زبانِ اہلِ دل پر مرحبا باد اباد ہوتا ہے

گرفتاری بشر کی ہے فقط دل کی گرفتاری
کہ دل آزاد ہو تو آدمی آزاد ہوتا ہے

گھر تو کیا گھر کا نشاں تک نہیں باقی صفدر
اب وطن میں کبھی جائیں گے تو مہماں ہوں گے

صفدر مرزا پوری

بشنوازنے

رباعیات

لاہور جاتے ہوئے

جب یادِ وطن کے صبح و شام آتے ہیں
مینہ دردِ نہاں کا دل پہ برساتے ہیں
لمحاتِ گزشتہ بن کے شمشیر وسناں
بے ساختہ روح میں اُتر جاتے ہیں

ایسے ہے وطن کی اب تمنّا دل میں
جیسے کوئی چُبھتا ہوا کانٹا دل میں
کل تک جو فقط نظر میں لہراتے تھے
اب ہیں وہ تمام شہر و صحرا دل میں

ہر نغمۂ نو اٹک رہا ہے دل میں
ارمان کوئی بھٹک رہا ہے دل میں
بستانِ وطن کی صبح! ہر پھول ترا لیا
کانٹا بن کر کھٹک رہا ہے دل میں

قتیل شفائی سے ملاقات

تریاق جو دل میں ہے تو سم بھی دل میں
اس وقت مسرّت بھی ہے غم بھی دل میں
یہ تجھ سے ملاقات کئی سال کے بعد
رقصاں ہے نشاط بھی الم بھی دل میں

لاہور میں ایک یادگار ملاقات

سر عبدالقادر سے

آزاد

اے آب و تابِ کشورِ پنجاب السّلام
قندیلِ علم و فضل کی محراب السّلام
اے آسمانِ نثر کے مہتاب السّلام
اُردو ادب کے اے دلِ بیتاب السّلام
اک داستانِ علم و ادب ہیں کہوں تجھے
یا آستانِ علم و ادب میں کہوں تجھے

میرے وطن کے قافلہ سالارِ علم و فن
آگاہِ کیف و لذّتِ اسرارِ علم و فن

آسان تجھ سے منزلِ دشوارِ علم و فن
خاکِ وطن کے ابرِ گہر بارِ علم و فن

تو وہ ہے صدرِ انجمن آرا کہیں جسے
وہ فرد ہے کہ ایک ادارہ کہیں جسے

تیرا قلم کہ رُوحِ ادب سے ہے آشنا
ہر دور میں رہا ہے ادیبوں کا رہنما

تو نے دکھا کے مہر و محبّت کا راستہ
صدق و صفا سے دامنِ اردو کو بھر دیا

روشن تری نگاہ پہ ہے راہِ علم و فن
مجھ کو پھر ایک بار کر آگاہِ علم و فن

عبدالقادر

جس کا ہر جذبہ محبت ہے وہ زنجیر ہے فن
زہر تریاق بنے جس سے وہ اکسیر ہے فن
جس سے ہر فکر منوّر ہو وہ تنویر ہے فن
جس سے ناخوب بنے خُوب وہ تدبیر ہے فن
نوعِ انساں کا اک آئینۂ تقدیر ہے فن
نقشۂ مہر ہے اخلاص کی تصویر ہے فن

فن کنارہ بھی ہے دریا کا سفینہ ہی نہیں
رفعتِ بام بھی ہے بام کا زینہ ہی نہیں
اوجِ سینا کی تجلّی بھی ہے سینا ہی نہیں
یہ تجسّس بھی ہے گم گشتہ دفینہ ہی نہیں

فن کا مفہوم چلانا بھی ہے جینا ہی نہیں
یہ پلانے کا سلیقہ بھی ہے پینا ہی نہیں

فن یہ تسلیم بہ ظاہر کوئی تلوار نہیں
فن یہ تسلیم کہ آمادۂ پیکار نہیں
اس کی تلوار سے کم تیز مگر دھار نہیں
یہ ہے کردار بھی گفتار ہی گفتار نہیں
جس کا مقصود نمائش ہو وہ ہتھیار نہیں
فن فقط تذکرۂ کاکل و رخسار نہیں

"بیا بہ مجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش"

پھر مزارِ اقبال پر

آزاد

اے فقیرِ بے نوا و بے گلیم
دَورِ نو میں صاحبِ ضربِ کلیم
دل کا مقصد تیرے اشعارِ جمیل
عقل کی حد تیرے افکارِ جلیل

دادهٔ افرنگ را پیغامِ شرق

ریختی بر صبحِ مغرب شامِ شرق

مانتا ہوں میں تری بانگِ درا

ہر دلِ بیدار کی ہے رہنما

اور ترے افکارِ بالِ جبرئیل

ہر قدم پر زندگانی کی دلیل

تیری لے سے زندہ ہیں سینوں میں دل

شمع ساں تابندہ ہیں سینوں میں دل

لیکن اے دانائے اسرار و رموز

میں کہ ہوں جویائے اسرار و رموز

دیکھتا ہوں اک بڑی مشکل میں ہوں

کیا خبر میں کون سی منزل میں ہوں

دل کہ تھا سرگرمِ پیکارِ حیات
آج اُسے پاتا ہوں بیزارِ حیات
زندگی بارِ گراں ہونے لگی
جان خود آزارِ جاں ہونے لگی
دل میں اب وہ ہائے وہو باقی نہیں
زندگی کی آرزو باقی نہیں
محوِ حیرت ہوں یہ کیا ہونے لگا
جذبۂ بیدار کیوں سونے لگا

اقبال

اے ز رازِ زندگی بیگانہ خیز	از شرابِ مقصدے مستانہ خیز
زندگی در جستجو پوشیدہ است	اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دلِ خود زندہ دار
تا نہ گردد مشتِ خاکِ تو مزار"

آزاد

پیسلسل جستجو کیا چیز ہے
شوق کیا ہے آرزو کیا چیز ہے
درخورِ ذوقِ کمالِ جستجو
آرزو ہے یا دلِ بے آرزو

اقبال

"آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست
فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا
سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا

طاقتِ پرواز بخشد خاک را
خضر باشد موسیِٔ ادراک را

گرم خوں انساں ز داغِ آرزو
آتش ایں خاک از چراغِ آرزو

از تمنّا مے بہ جام آمد حیات
گرم خیز و تیز گام آمد حیات

زندگی مضمونِ تسخیر است و بس
آرزو افسونِ تسخیر است و بس

آرزو صیدِ مقاصد راکمند
دفترِ افعال را شیرازہ بند

آرزو ہنگامہ آرائے خودی
موجِ بیتابے ز دریائے خودی"

آزاد

فہم سے بالا ہیں اسرارِ خودی
راز ہے اک راز گفتارِ خودی

دورِ حاضر میں ترا پیغامِ خاص

تیرے میخانے کا ہے یہ جامِ خاص

ہر طرف ہے ذکر اسی پیغام کا

مجھ کو بھی اک جرعہ دے اِس جام کا

اقبال

"پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہرچہ می بینی ز اسرارِ خودی است

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد

صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او

غیرِ او پیداست از اثباتِ او"

آزاد

میں نہیں سمجھا ابھی رازِ خودی

کھول مجھ پر سرِّ اعجازِ خودی

اک معمّہ ہے خودی کا راز ابھی

تشنۂ مضراب ہے یہ ساز ابھی

اے زرازِ زندگی آگاہ تر

فاش کر یہ راز مجھ پر فاش کر

اقبال

"نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است | زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

از محبّت می شود پائندہ تر | زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

از محبّت اشتعالِ جوہرش | ارتقائے ممکناتِ مضمرش

فطرتِ او آتش اندوز د زعشق

عالم افروزی بیاموزد زعشق"

آزاد

تجھ سے اپنے دل کی مشکل کیا کہوں
عشق کی توضیح کا محتاج ہوں
بس کہ مبہم عشق کی آواز ہے
یہ بھی مانندِ خودی اک راز ہے

اقبال

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق — ہست ہم تقلید از اسمائے عشق
عشق را از تیغ و خنجر باک نیست — اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست
در جہاں ہم صلح و ہم پیکارِ عشق — آبِ حیواں تیغِ جوہر دارِ عشق
از نگاہِ عشق خارا شق بود
عشقِ حق آخر سراپا حق بود"

آزاد

اے رموزِ زندگی سے باخبر
حُسن کی بھی اب ذرا تشریح کر
حُسن کا عالم میں ہنگامہ ہے کیا
عشق سے ہے کیا تعلّق حُسن کا

اقبال

"حُسن خلّاقِ بہارِ آرزوست
جلوہ اش پروردگارِ آرزوست

سینۂ شاعر تجلّی زارِ حُسن
خیزد از سینائے او انوارِ حُسن

از نگاہش خُوب گردد خُوب تر
فطرت از افسونِ او محبوب تر

از دمش بلبل نوا آموخت است
غازہ اش رخسارِ گُل افروخت است

سوزِ او اندر دلِ پروانہ ہا
عشق را رنگیں ازو افسانہ ہا"

آزاد

اے ترے نغمے سراپا انقلاب
دل میں باقی ہے ابھی اک اضطراب
زندگی کی اصل سے آگاہ کر
اس گدائے بے نوا کو شاہ کر
زیست کیا ہے زیست کا مقصد ہے کیا
اس بیاباں کی بالآخر حد ہے کیا
عقل کی مجبوریوں کو جان کر
میرے دل کی مشکلیں آسان کر

اقبال

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذّتِ تخلیق قانونِ حیات
با جہانِ نامساعد ساختن — ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرّات را
گردشِ ایّام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوّتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست — ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی است
ممکناتِ قوّتِ مردانِ کار — گردد از مشکل پسندی آشکار
زندگی کشت است و حاصل قوّت است — شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

اے ز آدابِ امانت بے خبر   از دو عالم خویش را بہتر شمر

چشم و گوش و لب کشا اے ہوش مند

گر نہ بینی راہِ حق بر من بخند"

مزارِ تاجور پر چند لمحے

اے دل! فدائے جلوۂ ہر دشت و ہر چمن
کس رنگ میں ہے آج تری محفلِ کہن
تنہا جو اپنی ذات میں تھا ایک انجمن
خاموش اب ہے خاک میں وہ بلبلِ سخن
اب اُس کے یادگار ترانوں کا ذکر کیا
ماضی کے دل نواز فسانوں کا ذکر کیا

اے دل نہ چھیڑ دورِ گزشتہ کا ماجرا
قصہ سنوں تمام نہیں مجھ میں حوصلہ
تو اتفاق سے جو یہاں تک ہے آگیا
آنسو و فورِ شوق میں اس خاک پر گرا
اے دل! یہاں ہے خاک میں پنہاں اک انجمن
یہ ہے مزارِ تاجورِ کشورِ سخن
اے رہنمائے قافلۂ شعر السّلام
اے زندہ دارِ ولولۂ شعر السّلام
مجھ میں ہے تجھ سے حوصلۂ شعر السّلام
آساں تجھی سے مرحلۂ شعر السّلام
غنچے کو اک نگاہِ محبّت سے پھول کر
آزاد کا سلامِ عقیدت قبول کر

رُوحِ تاجورؔ کی آواز

تو جو پھر لاہور میں وارد ہوا ہے اے جگنؔ[1]!
نکہتِ گُل لوٹ کر آئی ہے پھر سُوئے چمن
آج اپنے دیس میں آنا مبارک ہو ترا
اِس فضا میں نغمہ برسانا مبارک ہو ترا
دَورِ کہنہ کا فسانہ عصرِ نو کی داستاں
پھول ہے کس باغ کا تو جا کے مہکا ہے کہاں
اے پسر! اے نوجواں! اے مثلِ پیراں پختہ کار
لیلیٰ شعر و سخن کی محفلوں کے رازدار

---

[1] مولینا تاجور مرحوم مجھے بالعموم اسی نام سے پکارتے تھے۔

فیض گو تو نے اُٹھایا ہے مرے افکار سے

دل ترا وابستہ ہے اقبال کے اشعار سے

اے بسپر! یہ ہے ترے حق میں دُعائے ناچور

فکر ہو تیری مصافِ دہر میں سینہ سپر

تا قیامت دل ترا تاثیر کا مسکن رہے

ہاتھ میں اقبال کے افکار کا دامن رہے

روشنی اقبال کے افکار کی، اشعار کی

ہر گھڑی ہو رہنما تیرے دلِ بیدار کی

نغمۂ اقبال تجھ پر کیف برساتا رہے

تو اسی نغمے کی دھن پر ناچتا گاتا رہے

گلشنِ لاہور کے پھولوں کی اے رنگیں بہار

گلستانِ ہند کی تجھ کو فضا ہو سازگار

اس طرح ہندوستاں میں ہو ترا نغمہ بلند

طول و عرضِ ہند تیری ذات سے ہوا رجمند

یہ نئی دنیا تری یہ خطّۂ گنگ و جمن

یہ دیارِ بدّھ یہ گاندھی کا ہنسرو کا وطن

گلستانِ علم و حکمت کا مہکتا پھول ہے

مہرو اُلفت کا محبّت کا مہکتا پھول ہے

یہ نئی دنیا تری تہذیب کی ہے انجمن

دیکھ پاکیزہ رہے اس انجمن کا بانکپن

آج داخل ہے یہ محفل ایک نازک دور میں

اک تغیّر سا ہے اس کی زندگی کے طور میں

بے توازن سا نظر آتا ہے آج اس کا سرور

ظلمتیں بھی جادہ پیما ہیں یہاں ہمراہِ نُور

سر پھرے بھی اس میں ہیں کچھ نیک انسانوں کے ساتھ
چند دیوانے بھی ہیں موجود فرزانوں کے ساتھ
آج بھی کچھ کچھ نظر آتی ہے ایسوں کی نمود
ناگوارا جن کو تھا گاندھی سے انساں کا وجود
اے کہ ہے محروم کا اخلاق سرمایہ ترا
ان فضاؤں سے بہت اونچا رہے پایہ ترا
ہو کشادہ اپنے والد کی طرح تیری نظر
تنگیِ دل کی کدورت سے رہے تو دُور تر
پستیٔ افکار تیرے دل کے مسکن میں نہ ہو
"ناروا داری کا کانٹا تیرے گلشن میں نہ ہو"
ہو ترے شایانِ شاں تیرا ہر اک اندازِ فکر
دے صدا ہرگز کدورت کی نہ تیرا سازِ فکر

جانتا ہوں میں تعصّب سے بہت بالا ہے تو
اس زمانے میں بہت ارفع بہت اعلیٰ ہے تو
پھر بھی رستے سے بھٹک جاتے ہیں اکثر نوجواں
جوش کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں جب اپنی عناں
نعرہ بازی رہنما بنتی ہے جب انسان کی
آبرو ہوتی ہے رسوا دہر میں ایمان کی
گرچہ تجھ پر نعرہ بازی کا اثر کچھ بھی نہیں
جاہلوں کی فتنہ سازی کا اثر کچھ بھی نہیں
پھر بھی لازم ہے کہ تو اس امتحاں کے دور میں
ہو بہت محتاط اپنی زیست کے ہر طور میں
تنگیٔ دل کی طرف ممکن نہ ہو تیرا گزر
دیکھ حرف آنے نہ پائے خانداں کی لاج پر

اور وضاحت امتحاں کی یہ ہے اے میرے عزیز
اے مرے نورِ نظر! اے نوجوانِ باتمیز

ہند میں مسلم کو بیگانہ کوئی کہنے نہ پائے
یہ غلط بنیاد افسانہ کوئی کہنے نہ پائے

اس طرح مسلم رہے ہندوستاں کی گود میں
جس طرح رہتا ہے بچّہ اپنی ماں کی گود میں

بربریت کا زمانہ ہند میں واپس نہ آئے
خون آلودہ ترانہ ہند میں واپس نہ آئے

بھیڑئیے پھرنے نہ پائیں آدمی کے بھیس میں
آبرو مسلم کی ہو محفوظ تیرے دیس میں

بے خطر ہو جان بھی مسلم کی اور ایمان بھی
مال بھی اُس کا حفاظت میں ہو اس کی آن بھی

یہ تحفظ ہو تو پھر اس کی وفاداری کو دیکھ
دیکھ اپنے خون سے پھر اس کی گلکاری کو دیکھ
جاں لڑا دے گا یہ خود ہندوستاں کے واسطے
جس طرح مٹتا ہے بلبل گلستاں کے واسطے
یہ سراسر پیکرِ جذبات ہے' دیوانہ ہے
شمع ہو اخلاص کی روشن تو یہ پروانہ ہے
اس طرح مرتا ہے یہ جذبِ وفا کے نام پر
عورتیں جس طرح مرتی ہیں حیا کے نام پر
اس کی فطرت سے پرے ہیں عصرِ نو کے جوڑ توڑ
اس کو اپنا کہہ تو پھر جس طرح چاہے اس کو موڑ
شرط صرف اتنی ہے اس کو اس قدر احساس ہو
بس یقیں کا اس قدر سرمایہ اس کے پاس ہو

اس وطن میں اک حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں
یہ اسی گلشن کا ہے اک پھول بیگانہ نہیں

ہاں تو مقصد اس قدر ہے بس مری تقریر کا
مدّعا واضح ہو تیرے عالمِ تحریر کا

تیرا نغمہ فکر کی دنیا میں آوارہ نہ ہو
آسمانِ علم کا ثابت ہو سیّارہ نہ ہو

مقصدِ اعلیٰ ترے نغمے سے وابستہ رہے
اپنے دل میں سوچ لے اچھی طرح جو کچھ کہے

تیرا نغمہ زندگی کے درد سے معمور ہو
ظلمتوں کو چیرتا جائے سراپا نور ہو

پھول کی خوشبو لطافت میں ہو تیزی میں کٹار
تیرا نغمہ ہو گلستانِ محبّت کی بہار

اس بہاریں کیف پر بھی یہ قوی ہو اس قدر
ارتقا کے ہاتھ اس نغمے سے ہوں مضبوط تر
کیوں کہ ان ہاتھوں سے وابستہ ہے مُسلم کا وقار
عظمتِ ہندوستاں کے ہیں یہی سرمایہ دار
لیکن اے آزاد تو جانے سے پہلے ایک بار
اپنے نغمے سے کر اس ماحول کو پھر کیف بار
جس سے میرے کان مدّت تک رہے ہیں آشنا
پھر سُنا اک بار وہ تضمینِ "فرمانِ خدا[1]"

فرمائش پر آزاد کی نغمہ سرائی

فرمانِ خدا
فرشتوں سے

محتاج و غنی میں جو تفاوت ہے مٹا دو
انسان کو انسان کا ہمدرد بنا دو

---

[1] مولینا کی ایک پسندیدہ نظم

ارباب رعونت کو رعونت کی سزا دو
"اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو"
پیدا کرو انوارِ عمل روئے زمیں سے
بڑھ کر ہوں چمک میں جو ستاروں کی جبیں سے
تعمیر ہو اک عالمِ پائندہ ہمیں سے
"گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو"
ہر لب پہ ہے آزادیٔ کامل کا ترانہ
اس دَور میں شاہوں کی حکومت ہے فسانہ
درکار ہے اس قصر کے گرنے کو بہانہ
"سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو"

جب نورِ ازل مژدۂ پیغامِ سحر دے

ظلمت گہِ آفاق میں کیوں جان بشر دے

مابین جو پردے ہیں کوئی چاک انھیں کر دے

"کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے

پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو"

یہ عالمِ نو جانبِ الحاد رواں ہے

بے راہ روی اس کی تباہی کا نشاں ہے

افزائشِ سامانِ طرب کاہشِ جاں ہے

"تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے

آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو"

تاجور

یہ تو اے آزاد! تیری اک پُرانی نظم ہے
گرچہ اس میں شک نہیں ہے جادوانی نظم ہے
لیکن اب اپنی کوئی تازہ غزل مجھ کو سنا
تاکہ فنِ شعر میں دیکھوں میں تیرا ارتقاء

مولانا کی دوسری فرمائش پر

اشعار

نسیم شعلہ بنی اور شاخِ گُل تلوار
کچھ اس طرح سے گلستاں میں آئی فصلِ بہار

سکوں ملا جو نظر کو تو دل تڑپ اُٹھا
دل و نظر کو بہم مل سکا کبھی نہ قرار

خزاں کو صحنِ چمن سے گئے زمانہ ہوا
ابھی فضائے گلستاں میں اُڑ رہا ہے غبار

مقامِ وعظ کہاں اور مقامِ راز کہاں
مقامِ وعظ ہے منبر مقامِ راز ہے دار

لاہور میں ایک لمحہ

خود اپنے ہاتھ سے میں نے بہ قیدِ ہوش و حواس
اسی زمیں پہ تجھے آگ کے سپرد کیا
اسی زمیں پہ تجھے ڈھونڈنے کو آیا ہوں!
عجیب مجھ سے مقدّر نے انتقام لیا

"شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست

ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند"

چند ملاقاتیں

عالمِ خیال میں

سجاد ظہیر، فیض، احمد ندیم، ممتاز حسین اور ظہیر کاشمیری سے

شعرِ آزاد

زنداں نئے نئے ہیں گلستاں نئے نئے
دیکھ اے جنوں بہار کے ساماں نئے نئے
گلشن نئے نئے ہیں بہاریں نئی نئی
دامن نئے نئے ہیں گریباں نئے نئے

ممکن ہے ان کو رسمِ فغاں کی خبر نہ ہو
ہیں کچھ اسیر داخلِ زنداں نئے نئے
موسم نے دی صدا تو بیاباں میں آگئے
مشتاقِ نوکِ خارِ مغیلاں نئے نئے
داخل ہوئی ہے ایک نئے دور میں حیات
اب ہم ہیں اور خوابِ پریشاں نئے نئے
دیکھ اے نگاہِ شوق کہ بکھرے ہیں چار سو
افسانۂ حیات کے عنواں نئے نئے

سجاد ظہیر سے

آزاد

دورِ ظلمت ہے تجلی کی نظر ہونے تک
کاٹ دے رات کو ہنس ہنس کے سحر ہونے تک

پردۂ شب میں یہ ظلمات کا بوسیدہ نظام
سینکڑوں رنگ ابھی بدلے گا سحر ہونے تک
راہ میں تیرے کئی سخت مقام آئیں گے
اے مسافر! تجھے منزل کی خبر ہونے تک

سجّاد ظہیر

خس و خاشاک میں روحِ گلستاں لے کے آیا ہوں
خزاں کے دوش پر ابرِ بہاراں لے کے آیا ہوں
جہاں بے دردیوں سے ربط ہے دریاں سے نفرت ہے
وہاں بہرِ مداوا دردِ انساں لے کے آیا ہوں
جہاں نفرت ہمکتی ہے جہاں کینے لپکتے ہیں
محبّت کی وہاں جنسِ فراواں لے کے آیا ہوں

جہاں گفتار کی جرأت پہ فردِ جرم لگتی ہے
وہاں گلبانگ شرحِ دردِ پنہاں لے کے آیا ہوں

مرا منہ تک رہی ہیں ہمتیں اربابِ عالم کی
رہِ صرصر میں قندیلِ فروزاں لے کے آیا ہوں

خبر کر دو کوئی یہ تشنہ کامانِ تمنّا کو
کہ اپنے دوش پر خم کیا خمستاں لے کے آیا ہوں

جہاں صرصر گرجتی ہے جہاں شعلے بھڑکتے ہیں
وہاں رقصِ نسیم و شبنمستاں لے کے آیا ہوں

فیض احمد فیض سے

آزاد

"تو تو کہتا تھا مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم"

سالہا سال ہیں تبدیل ہوئے "چند ہی روز"

کیا اسی طرح سے جاں دینے پہ مجبور ہیں ہم

تو تو کہتا تھا کہ "فریاد کے دن تھوڑے ہیں"

تو تو کہتا تھا کہ "یہ جسم کی مایوس پکار

اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز"

فیض

"کہاں ہے منزلِ راہِ تمنّا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب ہم پر بھی گزرے گی یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے

ٹھہر اے دل! جمالِ روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی

دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے

اُٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صلا تو آ چکے محفل میں اُس کوئے ملامت سے

کسے روکے گا شورِ پند بیجا ہم بھی دیکھیں گے

کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم

جو اس ساعت میں پنہاں ہے اُجالا ہم بھی دیکھیں گے

جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے

وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے

وہ آئیں تو سرِ مقتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے "

ممتاز حسین سے

آزاد

ڈوبنا شرط ہے طوفاں تو کوئی شرط نہیں
تُند گرداب نہیں ہے تو کنارا ہی سہی
کام ہے ہم کو سہارے سے وہ ساحل ہو کہ موج
دور ساحل ہے تو موجوں کا سہارا ہی سہی
منزلِ شوق ہے دشوار ہو انجام بہ خیر!
تو بھی اے تلخیٔ ایّام گوارا ہی سہی

ممتاز حسین

دو چار ہی دن میں ایک نیا اندازِ گلستاں دیکھیں گے
ہم خاک کے ذرّے ذرّے میں تصویرِ بہاراں دیکھیں گے

اے جوشِ جنوں ایک روز تجھے یوں سلسلہ جنباں دیکھیں گے
جتنے خاموش عنادل ہیں ان سب کو غزل خواں دیکھیں گے
یوں آمدِ فصلِ بہاری کو گلزار میں رقصاں دیکھیں گے!
اے شاخِ فرومایہ تجھ کو ہر سمت گل افشاں دیکھیں گے
اس طرح کھُلے گا رازِ چمن ہر پھول بنے گا سازِ چمن!
اک نکہتِ گل کی موج میں ہم کُل رازِ گلستاں دیکھیں گے
وہ شمع جو آج بھی روشن ہے آندھی کے تھپیڑے کھا کھا کر
اُس شمع کا نور زمانے میں ہر سمت پرافشاں دیکھیں گے
کہتے ہیں جس کو دردِ بشر اُس درد کو اے روحِ فردا
ہر درد میں شامل پائیں گے ہر سانس میں غلطاں دیکھیں گے
وہ خاک کہ جس کے دامن میں ظلمت کے سوا اب کچھ بھی نہیں
اس خاک کے ذرّے ذرّے کو خورشید بداماں دیکھیں گے

ظلمات کی ہر اک موجِ کہن سورج کی کرن بن جائے گی

اے شامِ الم اک روز تجھے ہم صبحِ درخشاں دیکھیں گے

جب صبح کو سورج چمکے گا ہم اس کی حسیں تابانی میں

ہر غم کا مداوا پائیں گے ہر درد کا درماں دیکھیں گے

اس طرح زمانہ بدلے گا اس طرح ہوائیں پلٹیں گی

ہم کو جو پریشاں کرتے ہیں ہم اُن کو پریشاں دیکھیں گے

اُن سب کو ہراساں دیکھیں گے حائل ہیں جو اپنے رستے میں

اے آج کی مشکل تر منزل! ہم کل تجھے آساں دیکھیں گے

جس خون کے چھینٹوں سے اب تک تشکیلِ فسانہ ہو نہ سکی

اُس خون کے چھینٹوں کو ہم کل زینتِ دہِ عنواں دیکھیں گے

وہ محفل جو بے رنگ ہے آج اُس محفل میں کل صبح کو ہم

اک حسن کا دریا دیکھیں گے اک نور کا طوفاں دیکھیں گے

دنیا میں فروزاں ہونے سے جس ضو کو ابر نے روکا ہے
اُس ضو کے مستقبل کی قسم اُس ضو کو خراماں دیکھیں گے

اے رازِ محبت بول ذرا یہ عقدۂ نازک کھول ذرا
انسان سے آخر کب تک ہم انساں کو گریزاں دیکھیں گے

آخر ترا دھوکا کھائیں گے پابندئ انساں ہم کب تک؟
کب تک نہ بھلا ہم دنیا میں آزادئ انساں دیکھیں گے

اس وقت جو اپنے فکر میں ہے اس وقت جو اپنے عزم میں ہے
اس طرح کی اک تصویر تری اے عالمِ امکاں دیکھیں گے

احمد ندیم قاسمی سے

آزاد

کس بلندی پر مذاقِ نغمہ افشانی ہے آج!
جو بھی ہے نغمہ سرا طائر وہ زندانی ہے آج

کیا خبر اے ہمنشیں کیا اُس چمن کا ہو مآل
جس چمن میں یہ مآلِ نغمہ افشانی ہے آج

باغباں کو دیکھ کر مائل بہ تخریبِ چمن
کیا کہوں آزاد کو کتنی پریشانی ہے آج

کون ہے پردے میں پنہاں ہے بہارِ گلستاں
کیوں گلستاں پر مسلّط ایک ویرانی ہے آج

اک ضیا اُبھری تو تھی نظریں بھی چندھیائی تو تھیں
ظلمتوں کی پھر فضا میں کیوں پرافشانی ہے آج

دورِ آزادی یہ کیسا ہے گلستاں میں اگر
ہر طرف بند و سلاسل کی فراوانی ہے آج

کروٹیں لیتی ہے جس کے زمزموں میں حرّیت
دیکھ وہ نغمہ سرا آزاد زندانی ہے آج

احمد ندیم

"میں کیوں نہ اپنی ہی قندیلِ نو اُٹھا لاؤں
دیا بجھے تو سحر کا فریب کیوں کھاؤں

مری صداؤں سے لبریز ہے فضائے جہاں
ضمیرِ دہر ہوں شاہوں کے ہاتھ کیا آؤں

رچی ہوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

ستارے ٹوٹ کے کلیوں کے روپ میں چٹکیں
ذرا زمین کے پندار کو جو اُکساؤں

کسی کی زلف بھی منّت پذیرِ شانہ سہی
مگر میں کاکلِ گیتی تو پہلے سلجھاؤں

کئی برس سے مجھے مل رہا ہے درسِ خودی
یہی کہ تیرگیوں میں ہوا سے ٹکراؤں"

ظہیر کاشمیری سے

آزاد

رنگِ گلزار نگاہوں پہ گراں ہے اے دوست
یہ بہاروں کا سماں ہے کہ خزاں ہے اے دوست!
کون سی وادی و منزل میں ہے سرگرمِ سفر
ان دنوں قافلۂ عشق کہاں ہے اے دوست!
حریّت نے جو سجائی ہے مرے دیس میں آج
کیا یہی محفلِ صاحب نظراں ہے اے دوست!

کیا اسی بزم کی حسرت میں بھٹکتی تھی نظر
کیا یہی انجمنِ دیدہ وراں ہے اے دوست!

ہر طرف شور سا برپا ہے مگر کون بتائے
شورِ نغمہ ہے کہ یہ شورِ فغاں ہے اے دوست!

آج آزاد نے دیکھا ہے تجھے زنداں میں
خوب قدرِ ادب و شعر و زباں ہے اے دوست!

ظہیر کاشمیری

اب صاحبِ دواں آتے ہیں اب فاتحِ میداں آتے ہیں
وہ شیر تو شیرِ قالیں تھے اب شیرِ نیستاں آتے ہیں

جو تند مگولوں سے اُلجھے وہ عزمِ سفر کی بات کرے
اس منزلِ نو کے رستے میں کتنے ہی بیاباں آتے ہیں

آہنگِ تفنگ و تیر ہیں ہم گاتے ہیں سرودِ آزادی
ہنگامۂ دار و گیر میں ہم سرمستِ غزلخواں آتے ہیں

تسلیم کہ ساحل والوں نے اک سیلِ خراماں روک دیا
ساحل کا نشاں تک مٹ جائے کچھ ایسے بھی طوفاں آتے ہیں

ہم ایسے امن پسندوں کو الحاد کا طعنہ دیتے ہیں!
اس بزم میں خنجر در دامن جتنے بھی مسلماں آتے ہیں

پھولوں پہ مسرت ناچے گی کلیوں پہ اُجالا برسے گا
ہم لوگ برنگِ نورِ سحر اے صبحِ گلستاں آتے ہیں

قاتل بھی ظہیر اب دامن کے دھبوں کو چھپاتا پھرتا ہے
اس درجے سے مل کے چہروں پر ہم خونِ شہیداں آتے ہیں"

"جائے مشام دیدہ گُشُودم بہ بوئے گُل
پنداشتم کہ گردِ رہِ یار می رسد"

کراچی سے ایک تار

احسن[1] کا تار صدقِ فراواں لئے ہوئے
آیا وفا و مہر کا عنواں لئے ہوئے
غرق اُس کا بوئے سنبل و ریحاں میں لفظ لفظ
فقروں میں رنگِ کیفِ گلستاں لئے ہوئے

---

[1] ممتاز حسن احسن

آیا کچھ اس طرح سے کہ جیسے نسیم آئے
گلزار میں نوید بہاراں لئے ہوئے

اس طرح سے ملا کہ ملے جس طرح کوئی
ظلمت میں جلوۂ مہِ تاباں لئے ہوئے

آباد محفلوں کی سناتا کہانیاں
فرماں بہ کشورِ دلِ ویراں لئے ہوئے

کہتا ہوا کہ اے چمنِ شعر کی بہار!
اے تو کہ دل میں ہے غمِ پنہاں لئے ہوئے

لیتا ہے کروٹیں ترے نغمے میں سوزِ غم
تیرا سخن ہے درد کا عنواں لئے ہوئے

اے دوستوں کے دل سے قریب اور نظر سے دور
ہر سانس ہے ترا غمِ ہجراں لئے ہوئے

تیرا سرود تیرے غمِ دل کا ترجماں
تیری ہنسی ہے درد کا طوفاں لئے ہوئے

پھر آ وطن میں تو کہ نہ جانے کہاں کہاں
پھرتی ہے تجھ کو گردشِ دوراں لئے ہوئے

بزمِ مشاعرہ میں ترا انتظار ہے
ہے تیری یاد محفلِ یاراں لئے ہوئے

مجھ کو ملا یہ تار تو دوشِ صبا پہ میں
پہنچا وہاں متاعِ دل و جاں لئے ہوئے

جس محفلِ صفا میں محبّانِ دل نواز
بیٹھے تھے شوقِ دید کا ارماں لئے ہوئے

مرہم جراحتوں کا لئے بات بات میں
ہر ہر نفس میں درد کا درماں لئے ہوئے

عالم کی شورشوں میں لئے زمزموں کا رقص
تاریکیوں میں شمعِ فروزاں لئے ہوئے
دورِ خزاں میں لب پہ لئے ذکرِ نوبہار
آندھی کی زد پہ نغمۂ باراں لئے ہوئے
آزاد اُن سے جا ہی ملا مدّتوں کے بعد
دل میں ہزار شورشِ پنہاں لئے ہوئے

کراچی میں مشاعرے

آزاد کی غزلیں

جو دل کا رازِ بے آہ و فغاں کہنا ہی پڑتا ہے
تو پھر اپنے قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

تجھے اے طائرِ شاخِ نشیمن کیا خبر اس کی
کبھی صیّاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ دنیا ہے یہاں ہر کام چلتا ہے سلیقے سے
یہاں پتھّر کو بھی لعلِ گراں کہنا ہی پڑتا ہے

بہ فیضِ مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں
کہ رہزن کو امیرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

مروّت کی قسم تیری خوشی کے واسطے اکثر
سرابِ دشت کو آبِ رواں کہنا ہی پڑتا ہے

زباں تو ں پر دلوں کی بات جب ہم لا نہیں سکتے
جفا کو پھر وفا کی داستاں کہنا ہی پڑتا ہے

بھرے بازار میں جب کوئی بھی گاہک نہیں ملتا
تو پھر ہیرے کو جنسِ رائیگاں کہنا ہی پڑتا ہے

نہ پوچھو کیا گزرتی ہے دلِ خوددار پر اکثر
کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

O

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں
اب یہ بھی ہے بہت کہ تمھیں یاد آسکوں
یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ سے
نزدیک آسکوں نہ کہیں دور جا سکوں
ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں
پردے گرے ہیں وہ کہ نہ جن کو اُٹھا سکوں
کس طرح کرسکو گے بہاروں کو مطمئن
اہلِ چمن جو میں بھی چمن میں نہ آسکوں

تیری حسیں فضائیں مرے اے نئے وطن!
ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں

آزاد! سازِ دل پہ ہیں رقصاں وہ زمزمے
خود سن سکوں مگر نہ کسی کو سنا سکوں

○

بہ رنگِ نغمۂ دلکش زباں کچھ اور کہتی ہے
باندازِ سکوت اپنی فغاں کچھ اور کہتی ہے
مرے دل سے بہارِ گلستاں کچھ اور کہتی ہے
مگر آزاد! یادِ آشیاں کچھ اور کہتی ہے
تمھاری برق رفتاری بجا اے قافلے والو!
مگر رفتارِ میرِ کارواں کچھ اور کہتی ہے

سر آنکھوں پر تمھارا اِدّعا اے گلستاں والو
مگر مجھ سے تو خاکِ آشیاں کچھ اور کہتی ہے

نظر اُن کی زباں اُن کی ہیں کس کو معتبر سمجھوں
نظر کچھ اور کہتی ہے زباں کچھ اور کہتی ہے

فغاں کہتی ہے میں ہر دردِ پنہاں کا مداوا ہوں
ولیکن کاوشِ ضبطِ فغاں کچھ اور کہتی ہے

بتایا جا رہا ہے قافلہ منزل پہ آپہنچا
مگر اس قافلے کی داستاں کچھ اور کہتی ہے

غضب ہے نغمہ ہائے سارباں کچھ اور کہتے ہیں
مگر بانگِ درائے کارواں کچھ اور کہتی ہے

ادب پر اک جمود آیا ہوا ہے لوگ کہتے ہیں
مگر آزاد کی طرزِ بیاں کچھ اور کہتی ہے

قفس و آشیاں کی بات نہ کر
کرمِ باغباں کی بات نہ کر
اپنی منزل کو ڈھونڈنے والے
جرسِ کارواں کی بات نہ کر
مرا ہر سانس ہے نسیمِ بہار
مجھ سے دورِ خزاں کی بات نہ کر
اے کہ تقدیر کا یقیں ہے تجھے
یہ گماں ہے گماں کی بات نہ کر
وارداتِ زمیں کو دیکھ ذرا
گردشِ آسماں کی بات نہ کر
جلوۂ خاکیاں کا دور ہے یہ
نُورِ افلاکیاں کی بات نہ کر

دیکھ ذرّوں کی آج تابانی
انجم و کہکشاں کی بات نہ کر

جادۂ دردِ عشق کے راہی
دیکھ سود و زیاں کی بات نہ کر

فاش ہو رازِ دوستاں نہ کہیں
ستمِ دشمناں کی بات نہ کر

باغباں کا بھرم نہ کُھل جائے
قفس و آشیاں کی بات نہ کر

جو مجھے چھوڑ کر روانہ ہوا
مجھ سے اُس کارواں کی بات نہ کر

نہ سہی میں وہاں مگر یہ بدی
تو مرے گلستاں کی بات نہ کر

جس نے اپنے چمن کو بیچ دیا
مجھ سے اُس باغباں کی بات نہ کر

قسمِ جورِ دشمناں تجھ کو
کرمِ دوستاں کی بات نہ کر

آج سارے چمن کی خیر منا
اک مرے آشیاں کی بات نہ کر

گمرہی بھی تو ایک منزل ہے
شکوۂ گمرہاں کی بات نہ کر

سُستیٔ میرِ کارواں کی قسم
تیزیٔ کارواں کی بات نہ کر

زندگی امتحان ہے آزاد
عشق کے امتحاں کی بات نہ کر

غنچہ و گل کی نہ کہہ شاخِ نشیمن کی نہ پوچھ
یوں بہار آئی کہ سارا گلستاں گم ہو گیا

کچھ تو ہم لوگوں سے کہہ بھی اے امیرِ کارواں
بات کیا ہے کیوں نشانِ کارواں گم ہو گیا

ہاں یہی بے رنگ سا قطرہ جسے کہتے ہیں دل
اس کے اندر بار ہا سارا جہاں گم ہو گیا

آندھیاں اس زور سے بغض و عداوت کی چلیں
جو وہ اُلفت کا زمانے سے نشاں گم ہو گیا

اپنی دنیا میں اندھیرو ڈھونڈ لینے دو مجھے
کیا کہوں میں اب کہاں میرا جہاں گم ہو گیا

اس نئے بازار میں سود و زیاں کا ذکر کیا
وہ جو تھا اندیشۂ سود و زیاں گم ہو گیا

جادۂ منزل اگر گم ہے تو اس کا غم نہیں
غم یہ ہے نام و نشانِ کارواں گم ہوگیا

○

نذرِ سودا

ذوقِ سفر بجز ہوسِ خام کچھ نہیں!
اے شہرِ دوست! تجھ سے ہمیں کام کچھ نہیں

اپنے مذاقِ دید کی تسکین ہے اور بات
لیکن وہ دردِ رخ کا آرام، کچھ نہیں

جو بھی ہے سانس نامہ و پیغام ہے وہ آج
ظاہر میں گرچہ نامہ و پیغام کچھ نہیں

جو شوق ہے ترے سحر و شام کا اسیر
کیوں کر کہے کہ یہ سحر و شام کچھ نہیں

اک ربط سا ہے دل کو فضائے چمن کے ساتھ
مانا کہ اس چمن میں ہمیں کام کچھ نہیں

کراچی کی ایک مخصوص نشست میں

غزلِ آزاد

(۱۵ اگست ۴۷ء کی یاد میں کہی گئی)

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری

فضائیں ہر طرف کیوں دھجیاں آوارہ ہیں اُن کی
جنونِ سر فروشی تیرے افسانوں پہ کیا گزری

وصالِ شمع کی حسرت میں سب بیتاب پھرتے تھے
میں کیا جانوں حضورِ شمع پروانوں پہ کیا گزری

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

نشانِ برگِ گُل تک بھی نظر آتا نہیں ہم کو
سمجھ میں کچھ نہیں آتا گلستانوں پہ کیا گزری

جہاں نورِ سحر کے بھی قدم جمنے نہ پاتے تھے
بتائے کون آخر اُن شبستانوں پہ کیا گزری

وہ رنگ و نور سے بھرپور بستانوں پہ کیا بیتی
شباب و شعر سے معمور کاشانوں پہ کیا گزری

ابھی تو چشمِ عبرت وقت کی رفتار دیکھے گی
ابھی یہ کس طرح کہہ دیں ستم رانوں پہ کیا گزری

نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ
ہوا تھا کیا یہ اپنوں کو یہ بیگانوں پہ کیا گزری
(بیکراں)

ایک منظر

سمندر کے کنارے

کسی مہوش نے سر کا ئی نقاب آہستہ آہستہ
وہ اُٹھا روئے فطرت سے حجاب آہستہ آہستہ

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ

عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

اقبال

سخنے بہ پاکستان

اے مری ارضِ وطن! اے ارضِ پاکستاں سلام
بھیجتا ہے آج تجھ پر تیرا اک مہماں سلام
میں تری دنیا میں آیا اک مسافر کی طرح
جذبۂ اخلاص لایا اک مسافر کی طرح
تیرے گلزاروں میں آیا صورتِ بادِ سحر
لوٹنے والا ہوں اب تیرے گلستاں چھوڑ کر

منتظر ہیں میرے گھر والے جہاں جاتا ہوں میں

اے وطن اب جانبِ ہندوستاں جاتا ہوں میں

اے وطن! میرے وطن! میرے بزرگوں کے وطن

میری دنیائے طرب میری امیدوں کے چمن

تجھ سے رہ کر دُور میں تجھ کو بھلا سکتا نہیں

نقشِ الفت اپنے سینے سے مٹا سکتا نہیں

تیرے لاکھوں رنگ خوابیدہ مرے سینے میں ہیں

تیری لاتعداد تصویریں اس آئینے میں ہیں

لیکن ان سب سے ہے بڑھ کر درد کا تحفہ ترا

ہے فنا کے نام سے ناآشنا تحفہ ترا

درد کی سوغات بخشی ہے جو تیرے پیار نے

روحِ انعامات بخشی ہے جو تیرے پیار نے

یہ ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
"خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا"

اے وطن جانے سے پہلے تجھ سے کچھ کہتا ہوں میں
فکر کی موجوں میں تھوڑی دیر تک بہتا ہوں میں

گو بہ ظاہر تیری دنیا میں کمی کوئی نہیں
اس مزاجِ آب و گِل میں برہمی کوئی نہیں

پھر بھی تو اس پر نہ ہو مغرور اے میرے وطن
ارتقا کی منزلیں ہیں دور اے میرے وطن!

دیکھ کر غلّے کی ارزانی بہت دلشاد ہوں!
دودھ گھی کی ہے فراوانی بہت دلشاد ہوں

لیکن اے میرے وطن میرے دیارِ دل نشیں
دورِ نو میں دودھ گھی، غلّہ فقط کافی نہیں

کارخانوں کی کمی محسوس کرتا ہوں یہاں
چھیڑ اب شہروں کی دنیا میں مشینی داستاں

یہ نئی دنیا مشینوں کی ہے دنیا اے وطن!
اپنی دنیا میں کھِلا دے اب مشینوں کے چمن

ان مشینوں کا دھواں ابرِ رواں بن جائے گا
تیرے طول و عرض میں خوشحالیاں پھیلائے گا

تیرے پانی[1] پر مسلّط ہوں ترے اپنے جہاز
بس تجارت کی غرض سے آئیں غیروں کے جہاز

غیر ملکی جال تیری خاک پر بچھنے نہ پائے
یہ غلاظت سرزمینِ پاک پر بچھنے نہ پائے

لہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران میں میں نے پاکستان کے پانیوں میں ایک بھی پاکستانی جہاز نہ دیکھا۔ یہ تأثر وہیں سے پیدا ہوا۔ یہ غالباً ۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔

تیرے اپنے کارخانے تیری دنیا میں چلیں
اب نہ غیروں کے فسانے تیری دنیا میں چلیں

علم کہتا ہے کہ سرحد کی زمیں میں تیل ہے
آج کی ساری سیاست تیل ہی کا کھیل ہے
اے وطن! اس تیل کو باہر زمیں سے کھینچ لا
اور پھر اس تیل سے ہر رنگ کے انجن چلا
کارخانے تیل پہ جاری کرے سو ڈھنگ کے
دہر میں لیکن نہ یہ بھڑکائے شعلے جنگ کے

اے وطن! ماضی سے مانا تیرا رشتہ ہے قوی
اب ہو مستقبل سے بھی وابستہ تیری زندگی
جا چکا ہے اب زمانہ شوکتِ مغرور کا
پرفشاں ہے آج دنیا میں عَلَم مزدور کا

آج انساں جنگ کے ماحول سے بیزار ہے
آج دنیا کو فقط امن و اماں درکار ہے

تیرے طول و عرض میں امن و اماں کا راج ہو
جس پہ ہر فردِ بشر نازاں ہو ایسا راج ہو

آمریت کا نہ یہ فغفوریت کا دَور ہے
دَور یہ میرے وطن! جمہوریت کا دور ہے

نام ہی کا ہو نہ جمہوری ترے گھر کا نظام
بلکہ حصہ دار ہوں پوری طرح اس میں عوام

دَورِ نو کہتے ہیں جس کو وہ عوامی دور ہے
زیست کی دھڑکن سے پُر اس دَور کا ہر طور ہے

ذرّہ ذرّہ زندگی کے نُور سے معمور ہے
قطرے قطرے میں شعاعِ زندگی مستور ہے

جلوہ گر چاروں طرف ہے اب خرد کی روشنی
ہم بغل نورِ ازل سے ہے ابد کی روشنی

وقت کی آواز گوشِ دل سے سننا چاہیئے
شورشِ گرداب کو ساحل سے سننا چاہیئے

اے وطن! جو کچھ کہا ہے میں نے ان اشعار میں
بیش قیمت ہیں یہ باتیں زیست کے بازار میں

یہ فقط رنگینئ گفتار کی باتیں نہیں
یہ حقیقت ہے فقط اشعار کی باتیں نہیں

ختم ہے اب رات کی ظلمت سحر ہونے کو ہے
رات کا ہنگامہ اب زیر و زبر ہونے کو ہے

جلوہ آرا ہے افق پر صبح کی تنویر دیکھ
آنے والے دور کی روشن ترین تصویر دیکھ[1]

[1] علامہ اقبالؒ کے مصرع میں ایک لفظی تغیر ہے

ستمبر سنہ ۱۹۵۱ء

بیکراں

جگن ناتھ آزاد کا پہلا مجموعۂ کلام

صرف چند برس میں جگن ناتھ آزاد کو وہ شہرت و مقبولیت حاصل ہو گئی ہے جو دوسروں کو بیس سال سے کم کی ریاضت پر نصیب نہیں ہوتی۔ شعر و سخن کی شاید ہی کوئی محفل ہو جس میں جگن ناتھ آزاد کے چرچے نہ ہوتے ہوں۔ علم و ادب کا شاید ہی کوئی رسالہ ہو جس میں جگن ناتھ آزاد کی نظمیں امتیازی شان سے نہ شائع ہوتی ہوں۔

"بیکراں" کے آخر میں ایک عظیم الشان نظم "اُردو" کے عنوان سے ہے۔ جس میں جگن ناتھ آزاد نے اُردو کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔

یہ نظم کیا ہے ایک فریاد ہے جس سے دل تو پگھل ہی جاتا ہے مگر آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں۔ قدیم زمانے سے اس جدید دور تک اُردو کا ایک ایک محسن سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ کس کس حقیقت سے انکار کروگے۔

"نیا دور" لکھنؤ

اپریل ۱۹۵۷ء

تیسرا ایڈیشن

چار روپے پچاس نئے پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی

ستاروں سے ذرّوں تک

آزاد کا دوسرا مجموعۂ کلام

جگن ناتھ آزاد کی محبت سرشت اور وطن پرست طبیعت کا اندازہ کرنے کے لیے اُن کی صرف ایک نظم "سیرِ پاکستان" کا مطالعہ کافی ہے۔ جس میں انھوں نے اپنا دل چیر کر سامنے رکھ دیا ہے، اور جس کے ایک ایک نقطہ سے اُن کی شیفتگیِ وطن خون بن کر ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان اشعار سے جن پُرخلوص اور والہانہ کیفیت کا اظہار ہوتا ہے وہ کوئی مستعار چیز نہیں ہوسکتی۔ اس کا تعلق یکسر صداقتِ احساس سے ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد فساد و خونریزی نے جگن ناتھ آزاد کے دل میں جذبۂ انتقام پیدا نہیں کیا بلکہ ان میں جذباتِ محبت و انسانیت کو بیدار کر دیا جو اس وقت تک ان کے دل میں سو رہے تھے اور وہ شاعری کی اُس منزل پر پہنچ گئے جہاں تک بہت کم شاعروں کی رسائی ہوتی ہے۔

اس مجموعہ میں جابجا اُن کی رباعیات بھی نظر آتی ہیں، اور ان میں بھی وہی دردوسوز پایا جاتا ہے جو آزاد کی شاعری کی جان ہے۔

اس مجموعہ کی سب سے پہلی نظم "میرا موضوعِ سخن" بہت اہم ہے جس میں انھوں نے اپنی فکر کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے گویا ایک "شہر آشوبِ انسانیت" پیش کیا ہے۔

آزاد فارسی تراکیب کا استعمال کرتے ہیں، لیکن مقلدانہ نہیں بلکہ کارآگہانہ جس سے اُن کے وسیع و صالح مطالعے پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اِن کی شاعری کا پس منظر چونکہ روایاتِ ماضی سے علیحدہ نہیں ہے اس لئے اس میں ترنم بھی پوری طرح پایا جاتا ہے، اور ذہنِ سامع اس سے متاثر ہوتا ہے۔

"نگار" لکھنؤ اپریل سنہ ۱۹۵۱ء

دوسرا ایڈیشن

قیمت دو روپے آٹھ آنے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی